الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

ISSN 0970-180X

ہر انسان قدرت کا ایک چھپا ہوا خزانہ ہے
یہ صرف مشکلات کی ٹھوکریں ہیں
جو اس خزانہ کو اندر سے باہر لے آتی ہیں

ستمبر ۱۹۸۹
شمارہ ۱۵۴

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۲۵ روپیہ

جلد دوم ۱۲۵ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۵۴ ستمبر ۱۹۸۹

فہرست

	صفحہ		صفحہ
معجزاتی کلام	۲	یکساں انجام	۱۸
غلطی کی اصلاح	۴	نیند ایک نعمت	۱۹
عورت جنگ میں	۶	کراہتِ حق	۲۰
کتنا فرق	۸	ایک آیت	۲۱
الٹا نتیجہ	۱۰	امر المسلمین	۲۵
ایک اور اقلیت	۱۳	قربانی اور ہمارا معاشرہ	۲۸
بڑی ترقی	۱۴	ایک سفر	۳۲
سلیقہ مندی	۱۵	خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۵
تخریب، تعمیر	۱۷	شرائط ایجنسی الرسالہ	۴۸

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

معجزاتی کلام

محمد مارماڈیوک پکتھال (۱۸۷۵ - ۱۹۳۶) ایک انگریز نومسلم تھے ۔ انھوں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ کیا ہے جو کافی مشہور ہے ۔ انھوں نے اپنے ترجمہ قرآن کے ساتھ ایک دیباچہ لکھا ہے ۔ اس دیباچہ میں وہ قرآن کے ترجمہ کے مسائل کا ذکر کرتے ہیں ۔

اس سلسلہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ اس ترجمہ میں متن کے مطابق موزوں زبان اختیار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے ۔ مگر اس کا نتیجہ یہ نہیں ہے کہ عربی قرآن کی جگہ انگریزی قرآن تیار ہوگیا ہو ۔ عربی قرآن ایک ناقابلِ تقلید نغمگی کا مجموعہ ہے ۔ اس کی مجرد آواز ہی آدمی کے اندر ارتعاش پیدا کر کے اس کو رلا دیتی ہے ۔ اور اس پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتی ہے :

Every effort has been made to choose befitting language. But the result is not the Glorious Qur'an, that inimitable symphony, the very sounds of which move men to tears and ecstasy.

وہ چیز جس کو فنی اصطلاح میں ساؤنڈ آرٹ کہا جاتا ہے ، وہ قرآن کی زبان میں بدرجۂ کمال پایا جاتا ہے ۔ ایک قاری جب قرآن کو پڑھتا ہے تو اس کا صوتی آہنگ اتنا شاندار ہوتا ہے کہ نہ سمجھنے والے لوگ بھی اس سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتے ہیں ۔

ساؤنڈ آرٹ یا صوتی آہنگ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ذوقی چیز ہے ۔ اس کے بعض ظاہری پہلوؤں کو اشاراتی طور پر بیان کیا جا سکتا ہے مگر اس کی مکمل لفظی تشریح ممکن نہیں ۔ یہاں اس کی وضاحت کے لیے ایک سادہ مثال درج کی جاتی ہے ۔ قرآن کی ایک آیت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں : وكأين من نبيٍ قاتلَ معه ربّيون كثير (آل عمران ۱۴۶)

اس آیت میں ربّیون کی جگہ ربّانیون بھی استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ دونوں کے معنی بالکل ایک ہیں ۔ لیکن اگر اس آیت میں موجودہ لفظ بدل کر ربّانیون رکھ دیا جائے تو آیت کا سارا صوتی آہنگ بگڑ جائے گا ۔ یہی ہم آہنگ نغمگی پورے قرآن میں اپنے کمال درجہ میں پائی جاتی ہے ۔

قرآن ایک معجزہ ہے اپنے معنی کے لحاظ سے بھی اور اپنے الفاظ کے لحاظ سے بھی۔ ایک شخص عربی زبان جانتا ہو اور وہ قرآن میں غور و فکر کرے تو وہ اس کے اندر معانی کے اعتبار سے خدائی عظمت کا ادراک کرے گا۔ لیکن اگر ایک شخص اس کے معانی پر دھیان نہ دے، وہ صرف اس کی آواز سنے تب بھی وہ اس سے غیر معمولی نوعیت کا گہرا تاثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

تاریخ میں دونوں قسم کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ پہلی نوعیت کی بھی اور دوسری نوعیت کی بھی۔ فرانس کے پروفیسر ماریس بکائی (Maurice Bucaille) قرآن کی معنوی عظمت سے متاثر ہوئے اور انھوں نے قرآن کے گہرے مطالعہ کے بعد وہ کتاب لکھی جو حسب ذیل نام سے عمومی شہرت حاصل کر چکی ہے:

The Bible, The Qur'an and Science

انگلستان کے پروفیسر آربری (Arthur J Arberry) ایک بار تیونس میں مقیم ہوئے۔ ان کے پڑوس میں ایک مسلمان کا مکان تھا۔ ایک روز مسلمان ریڈیو پر قرآن کی قرأت سن رہا تھا۔ یہ آواز پروفیسر آربری کے کان میں پہونچی۔ وہ اس سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے قرآن کا مطالعہ شروع کیا، ان کی دلچسپی یہاں تک بڑھی کہ انھوں نے قرآن کا مکمل ترجمہ انگریزی زبان میں کر ڈالا۔ یہ ترجمہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے حسب ذیل نام کے تحت شائع ہوا ہے:

The Koran Interpreted

قرآن ایک ایسا کلام ہے جو اپنے اندر بے پناہ تسخیری قوت رکھتا ہے۔ اپنی خاموش معنویت کے اعتبار سے بھی، اور اپنی غیر معمولی ربانی آواز کے اعتبار سے بھی۔

غلطی کی اصلاح

خلیفۂ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایرانیوں اور مسلمانوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ ابتدائی مقابلہ میں ایرانی فوجوں کو شکست ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں ایرانی گھبرا اٹھے۔

اس وقت رستم ایران کا وزیر اعظم تھا۔ اس نے اپنے فوجیوں کو جمع کر کے مشورہ کیا کہ عربوں کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے کس ایرانی بہادر کو مقرر کیا جائے۔ سب نے بہمن جادویہ کا نام لیا۔ چنانچہ رستم نے بہمن جادویہ کو ۱۲ ہزار فوج ۳۰۰ جنگی ہاتھی اور دوسرے ضروری سامان دے کر عربوں کی طرف روانہ کیا۔ بہمن جادویہ کو جو سامان دیئے گیے ان میں درفش کاویانی بھی تھا۔ جس کی نسبت ایرانیوں کا عقیدہ تھا کہ جس فوج کے ساتھ یہ جھنڈا ہو اس کو کبھی شکست نہیں ہو سکتی۔ یہ واقعہ ۱۳ھ (۶۳۵ء) کا ہے۔

بہمن جادویہ چلتا ہوا دریائے فرات کے کنارے مقام ناطف میں آکر مقیم ہوا۔ دوسری طرف ابو عبید بن مسعود ثقفی اسلامی لشکر کے ساتھ فرات کے دوسرے کنارے مقام مروحہ میں مقیم تھے۔ بہمن جادویہ نے ابو عبیدہ کے پاس پیغام بھیجا کہ تم دریا پار کر کے ادھر آتے ہو یا ہم دریا پار کر کے تمہاری طرف آئیں۔ ابو عبید ثقفی نے جوش شجاعت میں یہ کہلا دیا کہ ہم دریا پار کر کے آتے ہیں۔

اسلامی لشکر نے ایک چھوٹے پل کے ذریعہ فرات کو پار کیا۔ جب وہ دوسری طرف پہونچے تو صورت حال یہ تھی کہ پیچھے کی طرف فرات کا چوڑا دریا تھا جو وسیع جنگی نقل و حرکت میں مانع تھا۔ دوسری طرف سامنے بہمن جادویہ کا مسلح لشکر تھا جس کے آگے جنگی ہاتھی صف باندھ کر کھڑے ہوئے تھے۔ اور ان ہاتھیوں پر تیر انداز بیٹھے ہوئے تھے تاکہ وہ لشکر اسلام پر بھرپور تیروں کی بارش کر سکیں۔

مسلمان اس وقت گھوڑوں پر تھے۔ ان کے گھوڑوں نے اس سے پہلے کبھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ ان کے گھوڑے ہاتھیوں کو دیکھ کر بدکنے لگے۔ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ان کے گھوڑے ان کے قابو سے باہر ہو رہے ہیں تو وہ گھوڑوں سے کود کر زمین پر آگیے اور پیادہ پا لڑنے لگے۔ مگر یہ طریقہ مزید خطرناک ثابت ہوا۔ ہاتھیوں نے جب آگے بڑھ کر مسلمانوں کی صفوں پر حملہ کیا اور انھیں کچلنا شروع کیا تو مسلمانوں کی صفیں درہم برہم ہونے لگیں۔

اس خونی معرکہ کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کے کئی سردار اور خود ابو عبید

مسعود ثقفی کو ہاتھیوں نے اپنے پیروں کے نیچے کچل دیا۔ مسلمانوں نے پیچھے ہٹنا چاہا تو وہاں دریا ان کی راہ میں حائل تھا۔ چنانچہ بہت سے لوگ دریا میں غرق ہوگیے۔ مسلم فوجیوں کی تعداد اس وقت ۹ ہزار تھی۔ اس میں سے تقریباً ۶ ہزار افراد جنگ میں کام آگیے۔

مسلمانوں کی بچی کھچی فوج دریائے فرات کے دوسری طرف جمع ہوئی۔ اب ایک صورت یہ تھی کہ ان کے شاعر اور خطیب اٹھتے اور اپنی شکست کو شہادت قرار دے کر اس کو گلوریفائی کرتے۔ جیسا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان کرتے ہیں۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس انھوں نے پورے معاملہ پر نظر ثانی کی اور اس کا اعتراف کیا کہ دریا کے اُس پار میدانِ جنگ بنا کر انھوں نے غلطی کی تھی۔

اب ایک طرف مسلمان مزید فوج جمع کر کے تیاری کرنے لگے، اور دوسری طرف ایرانیوں نے اپنے سردار مہران ہمدانی کو سالارِ جنگ بنا کر بہت بڑی فوج کے ساتھ دوبارہ مسلمانوں سے لڑنے کے لیے بھیجا۔ مہران ہمدانی جب فرات کے کنارے پہونچا تو اس نے مسلم فوج کے سردار مثنیٰ کو دوبارہ یہ پیغام بھیجا کہ تم دریائے فرات کو پار کر کے ہماری طرف آتے ہو یا ہم دریائے فرات کو پار کر کے تمہاری طرف آئیں۔ مسلم سردار نے دوبارہ وہ غلطی نہیں کی جو پہلی بار ان سے ہوگئی تھی۔ انھوں نے کہلا دیا کہ تم ہی فرات کو عبور کر کے ہماری طرف آؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اب دونوں فوجوں میں جب لڑائی ہوئی تو معاملہ برعکس تھا۔ ایرانی فوج کے پیچھے دریا تھا اور سامنے اسلامی لشکر۔ دوسری طرف اسلامی لشکر کا معاملہ یہ تھا کہ اس کے آگے ایرانی فوج تھی اور پیچھے کھلی ہوئی زمین۔ اس طرح میدانِ مقابلہ ایرانیوں کے خلاف اور مسلمانوں کے موافق ہوگیا، ایرانی فوج نے حسب سابق زبردست حملے کیے۔ انھوں نے اپنے ہاتھیوں کو بھی استعمال کیا مگر آخر کار انھیں شکست ہوئی۔ اسلام کے سپہ سالار مثنیٰ ابن حارثہ نے دریا کے اوپر لکڑی کے پل کو توڑ دیا تھا۔ چنانچہ ایرانی فوج جب پیچھے کی طرف بھاگی تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی راہ نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کی تلوار سے بچنے کی کوشش میں دریا کی موجوں میں غرق ہو جائے۔ ابن خلدون کی روایت کے مطابق ایرانی لشکر کے تقریباً ایک لاکھ آدمی مقتول ہوئے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے لشکر میں جو لوگ اس جنگ میں کام آئے ان کی تعداد صرف ایک سو تھی۔ یہ واقعہ رمضان ۱۳ھ میں پیش آیا۔

شکست کے بعد فتح کا یہ عظیم واقعہ اپنی غلطی کی اصلاح کا کرشمہ تھا۔

عورت جنگ میں

روسی زبان میں ایک کتاب عورتوں کے بارہ میں چھپی ہے جس کا انگریزی ترجمہ ماسکو سے شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کی تفصیل یہ ہے :

S. Alexiyerich, *War's Unwomanly Face*, Progress Publishers, Moscow

دوسری عالمی جنگ (۱۹۴۱) چھڑی تو روسی حکومت نے اپنے شہریوں سے جذباتی اپیلیں کیں اور مادر وطن (Motherland) کو بچاؤ کا نعرہ دیا۔ اس سے متاثر ہو کر جو روسی نوجوان فوج میں بھرتی ہوئے ان میں ۸ لاکھ (800,000) عورتیں تھیں جن کی عمریں ۱۵-۱۶ سال کے درمیان تھیں۔

مذکورہ کتاب انھیں خواتین سے متعلق ہے۔ خاتون مصنف نے اپنی ۴ سالہ تحقیق کے دوران ایک سو شہروں کا سفر کیا، انھوں نے دو سو شریک ہونے والی عورتوں کا انٹرویو لیا۔

یہ کتاب مذکورہ عورتوں کے بارے میں بہت سبق آموز معلومات پیش کرتی ہے۔ مثلاً کتاب میں بتایا گیا ہے کہ جنگ کے بعد اکثر عورتوں نے اس حقیقت کو چھپانا شروع کیا کہ وہ جنگ میں شریک ہوئی تھیں۔

"ہم نے چاہا کہ دوبارہ عام لڑکیوں کی طرح ہو جائیں، شادی کے قابل لڑکیاں"

We wanted to become ordinary girls again. Marriageable girls.

کتاب کی مصنف جنگ میں شریک ہونے والی ایک تعلیم یافتہ خاتون سے ملیں جن کا نام ویرا سفرمونا ڈودوڈوا (Vera Safrmovna Davdova) تھا۔ انھوں نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک بات کتاب کے بیان کے مطابق، یہ تھی کہ وہ یقین رکھتی ہیں کہ جنگ میں عورتوں کا ردّ عمل مکمل طور پر مردوں سے مختلف تھا۔ مردوں کا فیصلہ کسی تجربہ کے بارے میں زیادہ وقتی اور مبنی بر حقیقت ہوتا تھا۔ جب کہ عورتیں بہت زیادہ جذباتی انداز میں اپنا ردّ عمل ظاہر کرتی تھیں :

She believes that women reacted to war in a completely different way from men. The men were more matter-of-fact and casual about the experience, whereas the women reacted in an overwhelmingly emotional manner.

موجودہ زمانہ میں عورتوں کی فطرت اور ان کی پیدائشی صلاحیت کے بارہ میں کثرت سے تحقیقات کی گئی ہیں۔ عورت کی صنف کو خالص سائنسی اعتبار سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان تحقیقات کے ذریعہ جو باتیں معلوم ہوئی ہیں وہ حیرت انگیز طور پر عورت کے بارہ میں اسلام کے نقطۂ نظر کی تائید کرتی ہیں۔

جدید تحقیقات نے بتایا ہے کہ عورت پیدائشی طور پر زود حس ہے۔ وہ مرد کے مقابلہ میں جذباتی (Emotional) واقع ہوئی ہے۔ یہ دریافت واضح طور پر بتاتی ہے کہ عورتوں کو زندگی کے ایسے شعبوں میں داخل کرنا درست نہیں جہاں ٹھنڈے ذہن کے تحت فیصلہ کرنے کی ضرورت ہو۔ جہاں حالات کا تاثر قبول کیے بغیر رائے قائم کرنا پڑے۔ جہاں "مردانگی" کی ضرورت ہو نہ کہ "نسوانیت" کی۔

سیاست کا شعبہ، جنگ کا میدان، بین اقوامی معاملات، عدالتی قضیے، بڑے بڑے صنعتی منصوبے، اس طرح کے تمام شعبوں میں ذہنی ڈسپلن اور غیر جذباتی فیصلوں کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ ان امور میں وقتی محرکات سے اوپر اٹھ کر رائے قائم کرنا پڑتا ہے۔ اور ایسے تمام مواقع پر عورتیں اپنی فطری جذباتیت کی بنا پر غیر موزوں ثابت ہوتی ہیں۔ جب کہ مرد نسبتاً غیر جذباتی ہونے کی بنا پر زیادہ بہتر رد عمل پیش کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔

عورت اور مرد کا یہی پیدائشی فرق ہے جس کی بنا پر اسلام میں دونوں کا میدان کار الگ الگ رکھا گیا ہے۔ یہ درجہ کے فرق کی بات نہیں ہے بلکہ عمل کے میدان میں فرق کی بات ہے۔ یہ تفریق سائنسی تحقیقات کے عین مطابق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں نام نہاد آزادیٔ نسواں کے علمبرداروں کا طریقہ غیر سائنسی ہے نہ کہ اسلام کا طریقہ۔

کتنا فرق

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو مدینہ میں نفاق نے سر اٹھایا اور عرب اور عجم میں ارتداد پھیل گیا۔ لوگ کہنے لگے کہ وہ شخص دنیا سے چلا گیا جس کی وجہ سے عرب کو خدا کی مدد ملتی تھی۔ اس وقت خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا اور کہا کہ ان عربوں نے اپنی بکریوں اور اپنے اونٹوں کو روک دیا ہے۔ اور اپنے دین سے پھر گیے ہیں۔ اور عجم کے لوگ نہاوند میں جمع ہیں تاکہ ہم سے جنگ کریں۔ ان لوگوں کا گمان ہے کہ وہ شخص جس کی وجہ سے تمہاری مدد کی جاتی تھی وہ وفات پا گیا۔ اے لوگو اس معاملہ میں مجھے مشورہ دو۔

راوی کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر کی تقریر کے بعد لوگ سر جھکا کر خاموش ہو گیے اور دیر تک خاموش رہے۔ آخر حضرت عمر بن الخطاب گویا ہوئے اور انھوں نے کہا (فأطرقوا طویلاً ثم تکلم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، فقال) حیاۃ الصحابہ، الجزء الاول، صفحہ ۴۳۲)

حضرت ابوبکر صدیق کے سوال کے بعد لوگ کیوں دیر تک خاموش رہے۔ اس کی وجہ ان کی سنجیدگی اور ان کا تقویٰ تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو پہلے سوچتے تھے اور اس کے بعد بولتے تھے۔ وہ ہر قول اور ہر فعل سے پہلے اللہ سے ہدایت اور رہنمائی کی دعا کرتے تھے۔ جب خلیفۂ اول نے مذکورہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا تو اپنے مزاج کے مطابق سب کے سب سوچ میں غرق ہو گیے۔ ہر ایک دل ہی دل میں اللہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یہی وہ چیز تھی جس نے ہر ایک پر خاموشی طاری کر دی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کی یہ خاموشی ایک عظیم گفت گو تھی، ان کا یہ سر جھکانا سب سے بڑا اقدام تھا۔ چنانچہ وہ جب بولے تو ان کا بول تمام بولوں پر بھاری ہو گیا۔ جب وہ اٹھے تو ان کا اٹھنا تمام دشمنوں کو پست کرنے کے ہم معنی بن گیا۔ کیوں کہ ان کا بول خدا کی رہنمائی کے تحت تھا، ان کے اقدام میں خدا کی مدد ان کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔

اب دیکھیے کہ اس معاملہ میں موجودہ مسلمانوں، خاص طور پر ان کے رہنماؤں، کا کیا حال ہے۔ اس کا منظر دیکھنا ہو تو مسلمانوں کی کسی ایسی مجلس میں شریک ہو کر دیکھ لیجیے جو اس نوعیت کے

ہنگامی مسئلہ پر اکٹھا ہوئی ہو۔ مثلاً فلسطین، فرقہ وارانہ فساد، بابری مسجد، سلمان رشدی۔ جیسے مسائل۔ آپ دیکھیں گے کہ موضوع کا ذکر چھڑتے ہی ہر آدمی لسانی جہاد کا شہنشاہ بن گیا ہے۔ ہر آدمی پرجوش طور پر یہ چاہتا ہے کہ وہ سب سے پہلے بولے، اور آتشیں الفاظ کی پوری ڈکشنری کو بیک وقت اپنی زبان سے دہرا ڈالے۔

مگر یہ لفظی جوش دکھانے والے عمل کے وقت پھسڈی ثابت ہوتے ہیں۔ مارچ کے موضوع پر تقریروں کا دریا بہانے والے مارچ کی تاریخ آنے کے بعد خاموش ہو کر گھر میں بیٹھ رہتے ہیں۔ بول میں آگے رہنے والے عمل میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ بحث میں سب سے پہلے کھڑے ہونے والے اس وقت سر جھکا کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں جب کہ عملی اقدام کا وقت سر پر آگیا ہو۔

جو برتن جتنا زیادہ خالی ہو، وہ اتنا ہی زیادہ آواز دیتا ہے۔ اسی طرح جو آدمی جتنا زیادہ بے عمل ہو اتنا ہی زیادہ وہ پُرشور الفاظ بولتا ہے۔ بولنے والے کرتے نہیں، اور کرنے والے بولتے نہیں۔ اور حقیقت کی دنیا میں کرنے کی قیمت ہے نہ کہ بڑے بڑے الفاظ ہوا میں بکھیرنے کی۔

قیمت میں اضافہ

مہنگائی میں غیر معمولی اضافہ کی بنا پر تمام اخبار اور رسالے اپنی قیمتیں بڑھا چکے ہیں۔ مجبوراً فیصلہ کیا گیا ہے کہ الرسالہ اردو اور انگریزی کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا جائے۔ ماہ اکتوبر ۱۹۸۹ سے دونوں کی قیمتیں حسب ذیل ہوں گی:

فی شمارہ — پانچ روپیہ

سالانہ چندہ — ساٹھ روپیہ

صاحبانِ ایجنسی اگر تعداد میں کوئی تبدیلی کرنا چاہیں تو فوراً مطلع فرمائیں۔

الٹا نتیجہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز عرب کے شہر مکہ سے کیا۔ اس وقت مکہ میں قبیلہ قریش کے لوگوں کا غلبہ تھا۔ وہ آپ کے سخت مخالف ہوگیے۔

اس ابتدائی زمانہ میں قریش نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو کارروائیاں کیں، ان میں سے ایک کارروائی یہ تھی کہ وہ ولید بن المغیرہ کے پاس جمع ہوئے جو ان کے درمیان اپنی دانشمندی اور اپنی تجربہ کاری کی وجہ سے مشہور تھا۔ انھوں نے ولید سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ محمد کے بارے میں ایسی باتیں لوگوں کے درمیان پھیلادیں کہ وہ ان سے متوحش ہوجائیں اور ان کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔

اس کے بعد ان لوگوں کے درمیان مشورہ ہوا کہ لوگوں کے سامنے محمدؐ کی تصویر کس طرح پیش کی جائے۔ کسی نے کہا کہ ہم یہ مشہور کریں کہ وہ کاہن ہیں۔ کسی نے کہا کہ ہم ان کو دیوانہ بتائیں۔ کسی نے یہ کہا کہ ہم ان کو شاعر کہیں۔ ولید نے اس قسم کی تمام رایوں کو رد کر دیا۔ اس نے کہا کہ ہم کاہن اور دیوانہ اور شاعر کو جانتے ہیں۔ محمد کا کلام ان میں سے کسی کے کلام کے مشابہ نہیں۔ تم اس قسم کی جو بات بھی لوگوں سے کہوگے، اس کا جھوٹ ہونا ظاہر ہو جائے گا (وَمَا اَنتُم بِقَائِلِين مِن هٰذا شيئاً الا عُرِف اَنّه باطل) صفحہ ۲۸۴

لوگوں نے ولید سے کہا کہ پھر تم ہی بتاؤ کہ ہم محمدؐ کو کیا کہیں۔ اس نے کہا کہ سب سے قریب تر بات یہ ہے کہ ان کو جادوگر بتایا جائے۔ اور یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا ساحرانہ کلام پیش کر رہے ہیں جس کے ذریعہ سے خاندان کے افراد میں جدائی ہوگئی ہے اور ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار سے کٹ گیا ہے۔

قریش کے لوگ اس رائے پر متفق ہوکر اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف چلے گیے۔ اس کے بعد جب حج کا زمانہ آیا اور عرب کے مختلف حصوں سے بڑی تعداد میں لوگ زیارت کعبہ کے لیے مکہ آنے لگے تو قریش کے مخالفین مکہ کے چاروں طرف راستوں پر بیٹھ گیے۔ جو شخص ان کے پاس سے گزرتا اس کو روکتے اور بتاتے کہ دیکھو، یہ شخص (محمدؐ) جادوگر ہے۔ وہ ساحرانہ باتیں کرتا ہے۔ تم

اس سے بچ کر رہو۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ قریش نے اس متفقہ رائے پر باقاعدہ عمل کیا۔ چنانچہ حج کے بعد جب یہ تمام آنے والے لوگ اپنی بستیوں کو واپس ہوئے تو وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق مذکورہ خبر بھی اپنے ساتھ لے گیے۔ اور جو لوگ زیارتِ کعبہ کے لیے مکہ نہیں آسکے تھے ان کو قریش کی بات بتانے لگے۔ اس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ عرب کے تمام شہروں میں پھیل گیا۔ (فانتشر ذکرہ فی بلاد العرب کلھا) سیرت ابن ہشام، الجزء الاول، ۲۸۶۔

یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں دوسرے مقام پر رفع ذکر (الانشراح ۴) کہا گیا ہے۔ جب حق کا ایک داعی حق کی دعوت لے کر اٹھتا ہے تو وہ لوگ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں جن کے قیادتی مصالح یا معاشی مفادات اس سے ٹکرا رہے ہوں۔ وہ دعوت اور داعی کے دشمن بن جاتے ہیں۔ وہ اس کے خلاف بے بنیاد الزامات گڑھتے ہیں اور ان کو چاروں طرف پھیلاتے ہیں تاکہ داعی لوگوں کے درمیان بدنام ہو جائے۔ لوگ اس کی باتوں پر توجہ دینا چھوڑ دیں۔

مگر لوگوں کی مخالفانہ کوششوں کا عملی نتیجہ برعکس صورت میں نکلتا ہے۔ داعی کو بدنام کرنے کی کوشش داعی کے پیغام کو پھیلانے کا سبب بن جاتی ہے۔ بدنام کرنے کی کوشش عملاً لوگوں کے اندر تجسس کا مادہ پیدا کرتی ہے۔ وہ داعی اور دعوت کے بارہ میں مزید جاننے کے شائق ہو جاتے ہیں۔ اس طرح دعوت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان بنیادی طور پر ایک معقولیت پسند مخلوق ہے۔ وہ کسی بات کو صرف اس وقت مانتا ہے جب کہ اس کی عقل بھی اس کے حق میں گواہی دے رہی ہو۔ چنانچہ مخالفین جب اپنی بے بنیاد باتیں لوگوں کے درمیان پھیلاتے ہیں تو خود اپنی اندرونی فطرت کے تقاضے کے تحت لوگ اس کا موازنہ کرنے لگتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس کے بارے میں مزید تفصیلات جانیں اور پوری معلومات کی روشنی میں اپنی رائے قائم کریں۔

اس طرح داعی کے مخالفین اس بات کا ذریعہ بنتے ہیں کہ داعی جن لوگوں تک بذات خود نہیں پہونچا تھا ان لوگوں تک بھی داعی کی بات پہونچ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ داعیٔ حق کے خلاف پروپیگنڈا ہمیشہ داعی کے خانہ میں جاتا ہے۔ اس طرح زیادہ وسیع حلقہ میں داعی کی بات پہونچ

جاتی ہے۔ وہ خود تلاش کر کے داعی کے کلام تک پہونچتے ہیں اور اس کو سن کر یا پڑھ کر تفصیلی معلومات حاصل کرتے ہیں۔ اس کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں سچائی کی طلب ہوتی ہے وہ داعی کے دین کو اختیار کر کے اس کے ساتھی بن جاتے ہیں۔

آدمی اگر صحیح معنوں میں حق کو لے کر اٹھے تو نہ صرف اس کا براہ راست عمل دعوت کو پھیلانے کا ذریعہ بنتا ہے بلکہ مخالفین کا مخالفانہ عمل بھی بالواسطہ طور پر اس کی دعوت کی توسیع و اشاعت کا ذریعہ بن جاتا ہے ——— مخالف کی مخالفت سے نہ گھبرائیے، بلکہ اپنے آپ کو پوری طرح حق پر کھڑا کر لیجیے۔ اور اس کے بعد آپ کے مخالفین کا منفی شور و غل بھی آپ کے حق میں ایک مثبت سرمایہ بن جائے گا۔

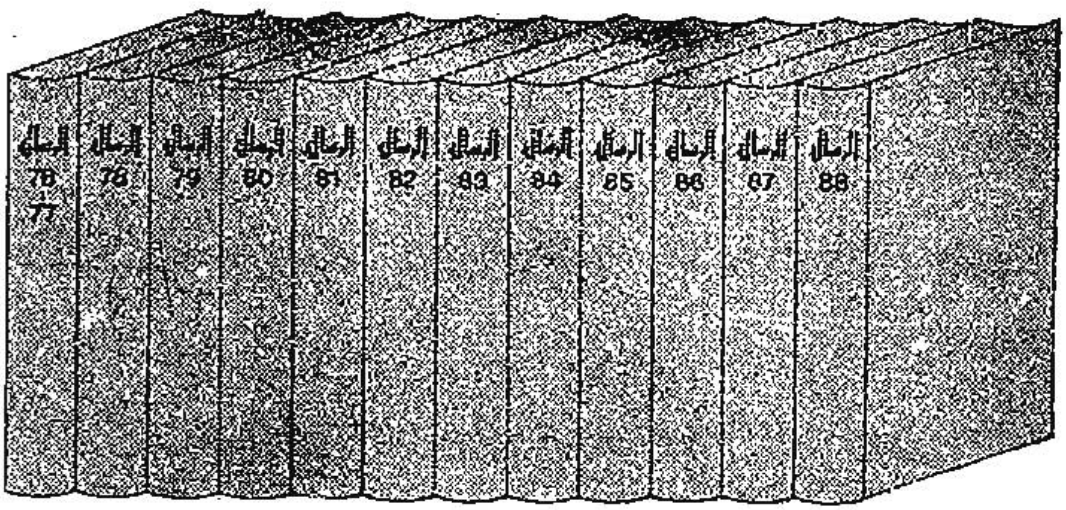

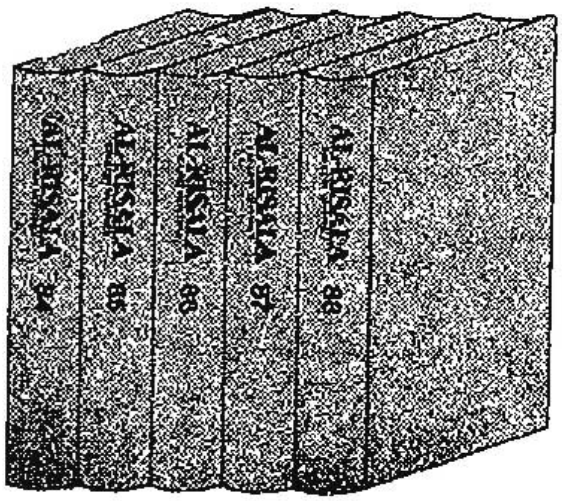

الرسالہ (مجلد)

الرسالہ اردو اور انگریزی ایک، ایک سال کی فائل مجلد کروائی گئی ہے۔ فی الحال الرسالہ اردو ۱۹۸۰ سے ۱۹۸۸ تک تیار ہے اور الرسالہ انگریزی کی مکمل فائل ۱۹۸۴ سے ۱۹۸۸ تک تیار ہے۔ ہدیہ فی جلد ۶۰ روپیہ

ایک اور اقلیت

مسٹر بی ایم بھاٹیا کا ایک مضمون ٹائمس آف انڈیا (۲ جنوری ۱۹۸۹) میں شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا ـــــ ہندستان میں دو قومیں ہیں، ایک مغربی تعلیم یافتہ، اور دوسرے بقیہ لوگ:

Two Nations In India: Western Educated And Others

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ مارکس نے صاحب جائداد اور بے جائداد کی بنیاد پر انسانوں کو دو طبقہ میں تقسیم کیا ہے۔ ہندستان میں ایسی کوئی تقسیم موجود نہیں۔ البتہ ایک اور تقسیم ہے جس نے ہندستان کو ایک طبقاتی سماج (Class society) بنا دیا ہے۔ ان میں سے ایک انگریزی تعلیم یافتہ مغربی طبقہ (English educated, westernised class) ہے۔ اور دوسرا عوام کا طبقہ جو جاہل یا غیر انگریزی تعلیم یافتہ ہے۔ ثانی الذکر طبقہ ملک کی ۸۰ فی صد آبادی پر مشتمل ہے۔ جب کہ اول الذکر طبقہ بمشکل پوری آبادی کا ۲۰ فی صد حصہ ہے۔

ملک کی دولت کا ۵۰ فی صد حصہ اسی ۲۰ فی صد آبادی کے پاس ہے۔ وہی انتظامی عہدوں پر قابض ہے، اسی کے ہاتھ میں ملک کی صحافت ہے۔ وہی تمام علمی اور تعلیمی اداروں پر چھایا ہوا ہے۔ وہی عملاً، براہ راست یا بالواسطہ طور پر، پورے ملک کو چلا رہا ہے۔ ہندستان میں انگریزی تعلیم برٹش انڈیا کمپنی نے ۱۸۳۵ میں شروع کی تھی۔ اب ڈیڑھ سو سال بعد یہ طبقاتی عمل اپنی آخری حد (Culmination) پر پہونچ چکا ہے۔ ۱۹۴۷ میں ہندستان کی آزادی طبقاتی تقسیم کے اس عمل کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ (صفحہ ۶)

اس واقعہ کا ایک پہلو وہ ہے جس کو مسٹر بھاٹیا نے بیان کیا ہے۔ تاہم اس میں ایک خوش آئند پہلو بھی ہے۔ اس تقسیم نے اس ملک میں کسی حقیقی اصلاحی کام کو بہت زیادہ آسان بنا دیا ہے۔ آپ یہاں کی آبادی کے ۲۰ فی صد حصہ پر کام کر کے پوری آبادی تک پہونچ سکتے ہیں۔ آپ غالب اقلیت پر براہ راست اشاعت افکار کا کام کیجئے، اور بقیہ ۸۰ فی صد اکثریت تک آپ کی دعوت بالواسطہ انداز میں پہونچ جائے گی ـــــ ہر تاریک پہلو میں ایک روشن پہلو چھپا ہوا ہوتا ہے، بشرطیکہ استعمال کرنے والے اس کو استعمال کر سکیں۔

بڑی ترقی

علم النفس کے ماہرین نے انسانی سوچ کی دو قسمیں کی ہیں ـــــ کنورجنٹ تھنکنگ (Convergent thinking) اور ڈائورجنٹ تھنکنگ (Divergent thinking) کنورجنٹ تھنکنگ یہ ہے کہ آدمی کی سوچ ایک ہی نقطہ کی طرف مائل رہے۔ ایک چیز اس کے فکر کی گرفت میں آئے مگر دوسری چیز اس کے فکر کی گرفت میں نہ آسکے۔ یہ غیر تخلیقی فکر ہے۔

ڈائورجنٹ تھنکنگ کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ڈائورجنٹ تھنکنگ یہ ہے کہ آدمی کی سوچ ایک رخ سے دوسرے رُخ کی طرف مڑ جائے، وہ ایک چیز کو دیکھے اور اس کے بعد اس کا ذہن دوسری چیز کی طرف منتقل ہو جائے۔ اسی کا دوسرا نام تخلیقی فکر ہے۔ (۲۴ جنوری ۱۹۸۹)

ایک شخص کسی بستی میں جوتا خریدنے گیا۔ وہاں کی آبادی کافی بڑی تھی۔ مگر وہاں جوتے کی دکان موجود نہ تھی۔ اب ایک شخص وہ ہے جو اس تجربہ سے صرف یہ جانے کہ مذکورہ بستی میں جوتے کی دکان نہیں ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس کے اندر صرف کنورجنٹ تھنکنگ ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے جس پر یہ تجربہ گزرا تو اس کا ذہن اس طرف منتقل ہو گیا کہ اس بستی میں جوتے کے گاہک ہیں مگر جوتے کی دکان نہیں، اس لیے اگر یہاں جوتے کی دکان کھولی جائے تو وہ بہت کامیاب ہو گی۔ اس نے فوراً وہاں جوتے کی ایک دکان کھول دی اور پھر زبردست نفع کمایا۔

یہ دوسرا شخص وہ ہے جس کے اندر ڈائورجنٹ تھنکنگ ہے۔ اس نے جوتے کی دکان میں ایک نئے کاروبار کی تصویر دیکھ لی۔ اس نے دکان کے نہ ہونے میں دکان کا ہونا دیکھ لیا۔

ڈائورجنٹ تھنکنگ کی صفت ان لوگوں میں ہوتی ہے جن کے اندر تخلیقیت (Creativity) کی صلاحیت ہو۔ یہی تخلیقیت تمام بڑی ترقیوں کی سب سے اہم شرط ہے۔ انھیں لوگوں نے بڑی بڑی سائنسی دریافتیں کی ہیں جن کے اندر تخلیقی ذہن ہو۔ انھیں لوگوں نے بڑے بڑے سیاسی کارنامے انجام دیے ہیں جو تخلیقی ذہن کے مالک ہوں۔ وہی لوگ اعلیٰ تجارتی ترقیاں حاصل کرتے ہیں جو تخلیقی فکر کا ثبوت دے سکیں۔

اس دنیا میں پانے والا وہ ہے جس نے کھونے میں پانے کا راز دریافت کر لیا ہو۔

سلیقہ مندی

کمانا مشکل ہے مگر خرچ کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ جو شخص صحیح طور پر خرچ کرنا جانے، وہ کم آمدنی میں بھی زیادہ آمدنی والی زندگی گزار سکتا ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی صحیح طور پر خرچ کرنا نہ جانے، وہ زیادہ آمدنی میں بھی کم آمدنی والے مسائل میں مبتلا رہے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص سلیقہ اور کفایت کے ساتھ خرچ کرنا جانے، اس کو گویا اپنی آمدنی کو بڑھانے کا ہنر معلوم ہو گیا۔ اس نے اپنی آمدنی میں مزید کمائے بغیر اضافہ کر لیا۔ خرچ کرنے سے پہلے سوچئے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح آپ کمانے سے پہلے سوچتے ہیں۔ جو کچھ کیجئے منصوبہ بند انداز میں کیجئے، اور پھر آپ کبھی معاشی پریشانی میں مبتلا نہ ہوں گے۔

فضول خرچی کا دوسرا نام معاشی تنگی ہے۔ اور کفایت شعاری کا دوسرا نام معاشی فارغ البالی۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لیے یہاں دو واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

مجھے ایک صاحب کا واقعہ معلوم ہے۔ انھوں نے ایم ایس سی کیا۔ اس کے بعد ان کو ۴۰۰ روپیہ ماہوار کی سروس ملی۔ انھوں نے طے کیا کہ اس رقم میں سے صرف دو سو روپیہ کو میں اپنی آمدنی سمجھوں گا اور بقیہ دو سو کو سیونگ اکاونٹ میں جمع کروں گا۔ ان کی تنخواہ بڑھتی رہی ——— ایک ہزار، ۲ ہزار، ۳ ہزار، ۴ ہزار، ۵ ہزار۔ مگر انھوں نے ہمیشہ کل تنخواہ کے نصف کو اپنی آمدنی سمجھا اور بقیہ نصف کو ہر ماہ بینک میں جمع کرتے رہے۔

اس طرح کی دس سالہ زندگی گزارنے کے بعد انھوں نے اپنا اکاؤنٹ دیکھا تو انھیں معلوم ہوا کہ ان کے اکاؤنٹ میں ایک بڑی رقم جمع ہو چکی ہے۔ اب انھوں نے سروس چھوڑ کر بزنس شروع کر دیا۔ آج وہ اپنے بزنس میں کافی ترقی کر چکے ہیں۔ مگر زندگی کا جو طریقہ انھوں نے ابتدا میں اختیار کیا تھا اسی پر وہ آج بھی قائم ہیں۔ وہ نہایت کامیابی کے ساتھ ایک خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔

اب اس کے برعکس مثال لیجئے۔ ایک صاحب کو وراثتی تقسیم میں یک مشت ایک لاکھ روپیہ ملا۔ انھوں نے اس کے ذریعہ سے کپڑے کی ایک دکان کھولی۔ دکان بہت جلد کامیابی کے ساتھ چلنے لگی۔ مگر چند سال کے بعد ان کی دکان ختم ہو گئی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے آمدنی اور لاگت کے فرق کو نہیں سمجھا۔ مثلاً ان کی دکان پر اگر ۵ ہزار روپیہ کا کپڑا بکے تو اس میں ساڑھے چار ہزار روپیہ لاگت کا ہوتا تھا اور ۵۰۰ روپیہ آمدنی کا۔ مگر وہ دکان میں آئی ہوئی رقم کو اس طرح خرچ کرنے لگے جیسے کہ ۵ ہزار کی پوری رقم آمدنی کی رقم ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ فضول خرچی کی بدترین شکل تھی۔ چنانچہ چند سال میں وہ دیوالیہ ہو کر ختم ہو گیے۔

اس دنیا میں سلیقہ مند زندگی کا نام خوش حالی ہے اور بے سلیقہ زندگی کا نام بدحالی۔

'Introduction to Islam' Series

1. The Way to Find God
2. The Teachings of Islam
3. The Good Life
4. The Garden of Paradise
5. The Fire of Hell

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Islam—the true religion of submission to God. The first pamphlet shows that the true path is the path that God has revealed to man through His prophets. The second pamphlet is an introduction to various aspects of the Islamic life under forty-five separate headings. Qur'anic teachings have been summarized in the third pamphlet in words taken from the Qur'an itself. In the fourth pamphlet the life that makes man worthy of Paradise has been described and in the last pamphlet the life that will condemn him to Hell-fire.

Maktaba Al-Risala
C-29 Nizamuddin West New Delhi 110013

تخریب، تعمیر

ٹائمس آف انڈیا ۱۳ اپریل ۱۹۸۹ (سکشن ۲، صفحہ ۴) میں نیویارک کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے ——— سپر کمپیوٹر میں امریکہ سے آگے بڑھ جانے کے لیے جاپان کی کوشش:

Japan's bid to excel the US in supercomputers

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سپر کمپیوٹر کے میدان میں امریکہ کا طویل مدت کا غلبہ اب مشتبہ ہو گیا ہے۔ امریکہ کی ایک کارپوریشن کے تجزیہ کاروں نے مطالعہ کے بعد یہ اعلان کیا ہے کہ جاپان کا بنایا ہوا ایک سپر کمپیوٹر ۱۹۹۰ میں مارکیٹ میں آجائے گا۔ یہ دنیا کی سب سے زیادہ تیز کام کرنے والی مشین ہوگی۔

جاپانیوں نے اس نئے کمپیوٹر کا نام ایس ایکس ایکس (SX-X) رکھا ہے۔ اس کی رفتار اتنی زیادہ ہے کہ وہ ایک سکنڈ میں سائنٹفک قسم کے حساب کے ۲۰ بلین آپریشن کر سکتا ہے۔ یہ جاپانی کمپیوٹر امریکہ کے تیز ترین کمپیوٹر سے ۲۵ فیصد زیادہ تیز رفتار ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی مزید خصوصیت یہ ہے کہ کامل صحت کارکردگی کے ساتھ نسبتاً وہ کم خرچ بھی ہے۔

اس سپر کمپیوٹر کی اہمیت صرف سائنٹفک ریسرچ، تیل کی تلاش اور موسم کی پیشین گوئی جیسی چیزوں ہی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ وہ نیشنل سیکورٹی کے لیے بھی بے حد اہم سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ نیوکلیر ہتھیاروں کی تیاری میں بہت زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔

نئے جاپانی کمپیوٹر نے دنیا کو ایک نئے صنعتی دور میں پہونچا دیا ہے۔ موجودہ کمپیوٹر جو کسی زمانہ میں "جدید" سمجھے جاتے تھے، اب وہ روایتی اور تقلیدی بن کر رہ گیے ہیں۔ حتی کہ جاپان کی اس ایجاد نے اس کو خود فوجی میدان میں بھی برتری عطا کر دی ہے۔

امریکہ نے "سپر بم" بنا کر ۱۹۴۵ میں جاپان کو تباہ کر دیا تھا۔ مگر وہ جاپان سے یہ امکان نہ چھین سکا کہ وہ "سپر کمپیوٹر" بنا کر دوبارہ نئی زندگی حاصل کر لے اور صرف ۴۵ سال کے اندر تاریخ کا رخ موڑ دے۔ تخریب، خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو، وہ تعمیر کے مواقع کو ختم نہیں کرتی، اور تعمیر کی طاقت، بہر حال تخریب کی طاقت سے زیادہ ہے۔

یکساں انجام

کارل مارکس کی لڑکی لورا (Laura) اور اس کے داماد پال لافراگ (Paul Lafargue) نے ۱۹۱۱ میں اجتماعی خودکشی کر لی تھی۔ اس خودکشی کا سبب مفلسی تھا۔ اشتراکی مفکر نے اپنے مشن کی تبلیغ میں اپنا سارا اثاثہ ختم کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس کی بیٹی اور داماد کے معاشی حالات بے حد سخت ہو گیے۔ آخرکار دونوں نے تنگ آکر بیک وقت اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔

کارل مارکس کی وفات کے بعد اس کے اشتراکی خیالات روس میں پھیلے۔ یہاں تک کہ روس میں اشتراکی انقلاب آگیا۔ ولادیمیر لینن پہلی اشتراکی ریاست کا پہلا وزیر اعظم بنا۔ وہ اپنے وقت کا سب سے زیادہ طاقت ور حکمراں تھا جو ایک وسیع ملک پر مکمل کنٹرول رکھتا تھا۔ ۲۱ جنوری ۱۹۲۴ کو اس کا انتقال ہو گیا۔

وفات سے پہلے لینن پر فالج کا حملہ ہوا۔ ایک عرصہ تک وہ اس طرح اپنے کمرہ میں پڑا رہا کہ وہ نہ ٹھیک طرح چل سکتا تھا اور نہ کچھ بول سکتا تھا۔ آخرکار زندگی سے عاجز آکر اس نے جوزف اسٹالن کو خط لکھا کہ وہ اس کو تھوڑی سی پوٹاشیم سائنائڈ (Potassium cyanide) فراہم کرے۔ تاکہ وہ اس کو کھا کر اپنا خاتمہ کر سکے۔ واضح ہو کہ پوٹاشیم سائنائڈ نہایت مہلک زہر ہے۔ منھ میں داخل ہوتے ہی وہ آدمی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

یہ انکشاف روس کے ممتاز ناول نگار الکزینڈر بک (Alexander Bek) کے ذاتی آثار سے ہوا ہے۔ ان کے ذاتی آثار میں لینن اور اسٹالن کی وہ تحریر مل گئی ہے جس سے مذکورہ واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے (ٹائمس آف انڈیا، ۲۳ اپریل ۱۹۸۹، صفحہ ۱۶)

یہ واقعہ نہایت سبق آموز ہے۔ وہ زندگی کی حقیقت کو بتا رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں غریبی اور امیری، محکومیت اور حاکمیت دونوں اضافی چیزیں ہیں۔ ایک دولت مند آدمی بھی بالآخر اسی بے کسی کے مسئلہ سے دوچار ہوتا ہے جس سے ایک غریب اور مفلس آدمی کو سابقہ پیش آتا ہے۔

یہاں ایک اور دوسرے میں کوئی حقیقی فرق نہیں۔

نیند ایک نعمت

موجودہ زمانہ میں نیند کا سائنسی مطالعہ کیا گیا ہے۔ امریکہ (نیویارک) سے ایک سائنٹفک جرنل شائع ہوتا ہے جس کا نام نیند (Sleep) ہے۔ یہ جرنل جس ادارہ سے نکلتا ہے اس کا نام حسب ذیل ہے:

Association of Professional Sleep Societies

امریکہ میں جو لوگ نیند کے اکسپرٹ سمجھے جاتے ہیں ان میں سے ایک ڈاکٹر جیمز اے ہارن (James A. Horne) ہیں۔ انھوں نے نیند سے متعلق سائنسی انداز سے ریسرچ کی ہے اور اعداد و شمار جمع کیے ہیں۔ ان کی رپورٹ نیویارک ٹائمز میں چھپی ہے جس کا خلاصہ ٹائمس آف انڈیا (۲۴ جنوری ۱۹۸۹) میں مختصر طور پر شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے کہ سوؤ، اگر تم تخلیقی بننا چاہتے ہو:

Sleep—if you want to be creative.

ڈاکٹر جیمز ہارن کا کہنا ہے کہ نیند کے متعلق نئی دریافتیں بتا رہی ہیں کہ نیند کا ایک خاص عمل یہ ہے کہ وہ انسان کے دماغ میں شعور سے ہونے والی ٹوٹ پھوٹ کو درست کرتی ہے:

The new findings seemed to support the view that one primary function of sleep is to "repair the cerebral cortex from the wear and tear of consciousness."

عام تجربہ یہ ہے کہ آدمی شام کو تھکا ہوا ہوتا ہے۔ دن بھر کے واقعات و حوادث اس کے ذہن میں تناؤ کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ مرجھائی ہوئی روح کے ساتھ بستر پر لیٹتا ہے۔ مگر چند گھنٹے سو کر جب وہ صبح کو دوبارہ اٹھتا ہے تو وہ اپنے آپ کو تر و تازہ پاتا ہے۔ وہ از سر نو اس قابل ہو جاتا ہے کہ زندگی کے معرکے میں بھرپور طور پر اپنا حصہ ادا کر سکے۔ وہ دوبارہ ایک نیا انسان بن جائے۔

آدمی کو یہ نئی زندگی نیند کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ نیند اس کے ذہن کی مرمت کر کے اس کو تازہ دم بنا دیتی ہے۔ اگر نیند کا نظام نہ ہو تو انسانی مشین تھوڑے ہی دنوں میں ناکارہ ہو کر رہ جائے۔

کراہتِ حق

قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر کہا گیا ہے کہ ہم نے لوگوں کے پاس حق بھیجا۔ مگر اکثر لوگ حق سے بیزار رہے (المومنون ۷۰، الزخرف ۷۸) قتادہ کہتے ہیں کہ ہم سے بتایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی۔ آپ نے اس سے کہا کہ اسلام قبول کر۔ آدمی نے کہا کہ آپ مجھ کو ایک ایسی چیز کی طرف بلاتے ہیں جو مجھے پسند نہیں۔ آپ نے فرمایا اگر تمہیں پسند نہ ہو تب بھی (قال قتادة : ذکر لنا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لقی رجلاً فقال : اسلم۔ فقال الرجل انک لتدعونی الی امرٍ انا لہ کارہ۔ فقال نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : وان کنت کارھاً)

اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کے لیے عمل کے دو راستے ہیں۔ ایک، اتباع حق۔ اور دوسرے، اتباع اہواء (المومنون ۷۱) حق پر چلنے کے لیے آدمی کو سوچ کر فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ اہواء (خواہشات) کا معاملہ یہ ہے کہ وہ آدمی کے اندر سے اپنے آپ اٹھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر معاملہ میں آدمی ابتدائی طور پر خواہشات کے راستہ پر چل پڑتا ہے۔ اور حق پر چلنے کے لیے خواہشات کو دبانا اور نفس کے تقاضوں پر صبر کرنا ضروری ہے۔

ایسی حالت میں اگر کوئی ایسی تحریک اٹھے جو لوگوں کی خواہشات کے مطابق ہو تو اس کا ساتھ دینے کے لیے لوگوں کو کسی محنت یا قربانی کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کیوں کہ یہ تو وہی راستہ ہوتا ہے جس پر لوگ عملاً پہلے ہی سے قائم ہوتے ہیں۔ ایسی تحریک کے ساتھ چلنے کے لیے لوگوں کو اپنا راستہ بدلنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی تحریکوں کے گرد بہت جلد لوگوں کی بھیڑ اکٹھا ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس جب حق کی بے آمیز دعوت اٹھتی ہے تو وہ گویا راستہ بدلنے کی دعوت ہوتی ہے۔ اس کو ماننا یہ تقاضا کرتا ہے کہ آدمی اپنی سوچ کو بدلے۔ اپنے جذبات پر روک لگا کر اس کو ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف موڑ دے۔ مزید یہ کہ حق کی دعوت کو ماننا لوگوں کے لیے عزت اور ساکھ کا سوال بھی بن جاتا ہے۔ کیونکہ حالتِ موجودہ میں حق کو ماننا دوسرے لفظوں میں یہ کہنے کے ہم معنی ہوتا ہے کہ "میں غلطی پر تھا"

یہی وجہ ہے کہ جب بھی بے آمیز حق کی دعوت اٹھتی ہے تو اکثر لوگ اس کو ماننے میں کراہت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ وہ اس سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

ایک آیت

فاستقم کما اُمرت ومن تاب معك ولا تطغوا انه بما تعملون بصیر ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار ومالکم من دون الله من اولیاء ثم لا تنصرون (ہود ۱۱۲-۱۱۳)

پس تم جمے رہو جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے اور وہ بھی جس نے تمہارے ساتھ توبہ کی ہے اور حد سے نہ بڑھو، بے شک اللہ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو۔ اور ان کی طرف نہ جھکو جنھوں نے ظلم کیا، ورنہ تم کو آگ پکڑ لے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں، پھر تم کہیں مدد نہ پاؤ گے۔

اس آیت میں جس استقامت کا حکم دیا گیا ہے وہ بے آمیز دعوت پر استقامت ہے۔ اور عدم رکون (نہ جھکنے) سے مراد یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہرگز کوئی خارجی اثر قبول نہ کرو۔ ہر حال میں اسی دعوتِ توحید پر قائم رہو جس کی تمہیں تلقین کی گئی ہے۔

انسانی سماج میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ غیر خدا کی پرستش میں مبتلا ہو جاتے ہیں، کبھی خدا کو چھوڑ کر اور کبھی خود خدا کے نام پر۔ اس لیے جب بھی سچی خدا پرستی کی دعوت اٹھتی ہے تو وہ تمام لوگ بھڑ اٹھتے ہیں جو غیر خدائی بنیاد پر اپنی زندگی کا ڈھانچہ کھڑا کیے ہوئے ہوں۔

یہاں داعی بیک وقت دو سخت ترین آزمائش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایک یہ کہ مدعو کی اشتعال انگیزی کے باوجود وہ مکمل طور پر صبر کی روش پر قائم رہے، وہ کسی حال میں صبر و اعراض کی راہ سے نہ ہٹے۔ دوسرے یہ کہ مدعو کے لیے قابلِ قبول بنانے کی خاطر وہ دعوت میں کسی بھی قسم کی لچک نہ دکھائے۔ گویا ایک طرف اصل نکتۂ دعوت پر جماؤ، خواہ اس کے نتیجہ میں مدعو کا ردِ عمل شدید سے شدید تر کیوں نہ ہو جائے۔ اور دوسری طرف اپنی داعیانہ تصویر کو برقرار رکھنے کی خاطر مدعو کے ہر ظلم کو یک طرفہ طور پر برداشت کرنا۔

یہاں جس عدمِ رکون کا ذکر ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنی قومی شناخت کو قائم رکھنے پر پوری طرح جمے رہو۔ ایسا ہرگز مت کرو کہ ٹوپی اور شیروانی اتار کر ہیٹ اور پتلون پہننے لگو۔ اسی طرح اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ حکمرانوں کے خلاف اپنی تحریک میں کسی قسم کی مصالحت نہ

دکھاؤ، ان کو تخت سے بے دخل کرنے کے سوا کسی اور بات پر راضی نہ ہو۔ آیت کی ایسی ہر تشریح بالکل لغو ہے۔ قومی عدمِ رکون یا سیاسی عدم رکون کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ آیت سراسر آداب دعوت سے متعلق ہے۔ یہاں عدمِ رکون سے مراد پیغام توحید کے بارہ میں عدم رکون ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوتِ توحید کے خالص پن (Purity) کو پوری طرح باقی رکھو۔ اس میں کسی بھی قسم کی آمیزش نہ کرو۔ قومی حقوق کا مطالبہ، مادی زیادتیوں کے خلاف احتجاج۔ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے اسلوب دعوت کو بدلنا، عوام کے درمیان مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ان کی دل پسند بولی بولنا۔ دعوت کے اصل نکتہ کے ساتھ ایسی باتوں کو شامل کرنا جس سے لوگوں کی بھیڑ جمع ہوتی ہو۔ یہ سب رکون میں شامل ہے۔ اور ایسی ہر چیز سے کامل پرہیز داعی کے لیے انتہائی طور پر ضروری ہے۔

دعوت کا کام سراسر ایک مثبت کام ہے۔ مگر اس کی صحیح انجام دہی کے لیے دو منفی شرطیں ہیں۔ ایک عدمِ طغیان، اور دوسرے عدمِ رکون۔ امام حسن بصری نے اس بات کو اس طرح بیان کیا کہ اللہ نے دین کو دو لا (نہیں) کے درمیان رکھا ہے۔ تجاوز نہ کرنا، اور جھکاؤ نہ دکھانا۔ (عن الحسن، جعل اللہ الدین بین لاءین ولا تطغوا ولا ترکنوا، تفسیر النسفی)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں یہ دونوں چیزیں بہت واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ مثلاً مکہ میں ۱۳ سال تک مدعو قوم آپ اور آپ کے اصحاب کے اوپر ہر قسم کا ظلم کرتی رہی۔ مگر آپ نے ان کے خلاف کسی بھی قسم کا ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ ہمیشہ آپ یک طرفہ صبر کی روش پر قائم رہے۔ ان کی زیادتیوں کے باوجود آپ نے نہ کبھی احتجاج کیا اور نہ حقوق طلبی کی مہم چلائی۔

اسی طرح مکہ کے سرداروں نے آپ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ہم آپ کی دشمنی چھوڑ دیں گے، آپ ہماری صرف ایک شرط کو پورا کر دیں۔ وہ یہ کہ آپ ہمارے بتوں کو برا نہ کہیں۔ یہ تمام بت دراصل ان کے فوت شدہ بزرگ تھے۔ ان بزرگوں کی تصویر بنا کر وہ ان کو پوجتے تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تنقیدوں کی زد ان پر پڑتی تھی جس سے ان کی عقیدتمندیوں کو سخت ٹھیس لگتی تھی۔ انھوں نے چاہا کہ ان کی غیر خدائی عقیدتمندیوں پر ضرب نہ لگے تو وہ آپ کو اور آپ کے مشن کو گوارا کریں گے۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

یہ دونوں چیزیں انسان کے لیے بے حد سخت ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان سے زیادہ سخت چیز اور کوئی اس دنیا میں نہیں۔

مذکورہ آیت میں جو حکم دیا گیا ہے، اس کی اسی سنگین نوعیت کی بنا پر وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے بہت شدید ثابت ہوئی تھی۔ البغوی نے نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی آیت نہیں اتری جو آپ پر اس آیت سے زیادہ شدید ہو۔ اسی لیے آپ نے فرمایا کہ سورہ ہود نے مجھ کو بوڑھا کر دیا (ما نزلت علیٰ عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آیۃ ھی اشد علیہ من ھذہ الآیۃ ولذلک قال: شَيَّبَتْنِي سورۃ ھود)

قومی رجحان

ہر قوم کا ایک قومی رجحان ہوتا ہے۔ اس رجحان کا ساتھ دینے سے قوم کے اندر قیادت اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اور جو شخص اس رجحان کے خلاف بولے، وہ قوم کے اندر بے جگہ ہو جاتا ہے۔ اس کو قوم کے اندر نہ مقبولیت حاصل ہوتی اور نہ قیادت۔

اس معاملہ کو وقت کی ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ ہندستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر کا مسئلہ ہے۔ ہندستان کا قومی رجحان یہ ہے کہ کشمیر ایک حل شدہ معاملہ ہے۔ اس کے برعکس پاکستان کا قومی رجحان یہ ہے کہ کشمیر ایک غیر حل شدہ اور متنازعہ معاملہ ہے۔ چنانچہ دونوں ملک کے لیڈر جب اس مسئلہ پر بولتے ہیں تو وہ اپنے یہاں کے قومی رجحان کی پوری رعایت کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس کے خلاف بولتے ہی وہ ختم ہو جائیں گے۔

اس کی مثال دونوں ملکوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً ہندستان میں آنجہانی راج گوپال اچاری نے کہا کہ کشمیر کا مسئلہ ابھی طے ہونا باقی ہے، اس کے بعد وہ ملک کے اندر بالکل غیر مقبول ہو گیے۔ اسی طرح پاکستان میں خان عبدالغفار خاں کا کہنا تھا کہ کشمیر کا مسئلہ آخری طور پر طے ہو چکا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پاکستان میں غیر مقبول ہو کر رہ گیے ——— اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ چیز کیا ہے جس کو قرآن میں رکون (ھود ۱۱۳) کہا گیا ہے۔

رکون (جھکاؤ) اگر کسی گروہ کی طرف ہو تو اس سے آدمی کی عوامی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

لیکن جب آدمی گروہی تقاضوں کو نظر انداز کرکے خالص حق کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرتا ہے تو وہ لوگوں کے درمیان اکیلا ہو کر رہ جاتا ہے۔ رکون کا راستہ سب سے زیادہ آسان راستہ ہے۔ اور عدم رکون کا راستہ سب سے زیادہ مشکل راستہ۔

قوم کا رجحان خواہش پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس داعی اصول کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے۔ اب اگر داعی اصول کی بات کہے تو وہ قوم سے کٹ جائے گا، اور اگر وہ قومی رجحان کے مطابق بولے تو حق کی نمائندگی نہیں ہوتی۔ یہ بے حد نازک امتحان ہے۔ مگر داعی کو لازماً حق بات کہنا چاہیے۔ اگر اس نے "قومی آگ" سے بچنے کی خاطر حق کا اعلان نہیں کیا تو اس کو "خدائی آگ" پکڑ لے گی، اور یقیناً خدا کی آگ، قوم کی آگ سے زیادہ سخت ہے۔

اقوالِ حکمت

جیبی سائز

الرسالہ کے پہلے صفحہ پر ہر ماہ جو مختصر اقوال چھپتے رہے ہیں، وہ اور کچھ دوسرے حکیمانہ اقوال ملا کر یہ کتاب تیار کی گئی ہے جو جیبی سائز کے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر ایک قول جلی خط میں درج کیا گیا ہے۔

یہ کتاب گویا زندگی کی سائنس ہے۔ اس میں کامیابی اور ترقی کے گُر بتائے گیے ہیں۔ وہ نہ صرف آپ کے لیے ایک رہنما کتاب ہے، بلکہ وہ آپ کی طرف سے آپ کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لیے بہترین تحفہ ہے۔ دکاندار حضرات اپنے گاہکوں کو یہ کتاب بطور گفٹ دے کر اپنی تجارت کو فروغ دے سکتے ہیں۔

امر المسلمین

ہندستان کے مسلم رہنما جس چیز کو مسلمانوں کے ملی مسائل کہتے ہیں، وہ درحقیقت مسلمانوں کے قومی مسائل ہیں۔ یہ مسلمانوں کے اپنے قومی حقوق اور مادی مفاداتِ کا جھگڑا ہے جو انھوں نے اس ملک کی حکومت اور یہاں کے اکثریتی فرقہ کے خلاف بے معنی طور پر چھیڑ رکھا ہے۔ اس قومی عمل کو اسلامی عمل ثابت کرنے کے لیے ان کے رہنماؤں نے ایک حدیث دریافت کرلی ہے۔ وہ حدیث یہ ہے: من لم یھتم بامر المسلمین فلیس منھم (جو شخص مسلمانوں کے معاملہ کے لیے فکرمند نہ ہو وہ ان میں سے نہیں)

ہمارے رہنماؤں نے اس حدیث سے "امر المسلمین" کا لفظ لیا اور اس کو موجودہ مسلمانوں کے تمام قومی جھگڑوں پر منطبق کر دیا۔ مگر استدلال کا یہ طریقہ لغویت کی حد تک غلط ہے۔ امر المسلمین سے کون سا "امر" مراد ہے، اس کا تعین قرآن وسنت سے ہوگا، نہ کہ موجودہ مسلمانوں کے اپنے قومی رواجوں سے۔

اس حدیث میں امر المسلمین کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان نامی گروہ جس چیز کو بھی اپنا امر (معاملہ) سمجھ لے، وہ مسلمانوں کا امر بن جائے گا، اور اس کے لیے فکرمند ہونا اور اس کے لیے تدبیر کرنا ضروری ہو جائے گا۔ امر المسلمین وہ ہے جو خدا و رسول کے نزدیک امر المسلمین ہو نہ کہ خود مسلمانوں کے نزدیک امر المسلمین۔

مکہ کے مسلمانوں پر ہر قسم کا ظلم کیا جا رہا تھا۔ انھوں نے چاہا کہ اپنی مظلومیت کو ختم کرنے کے ظالموں سے جنگ کریں، مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو امر المسلمین نہیں مانا اور ان کو یکطرفہ طور پر صبر کرنے کا حکم دیا۔ حدیبیہ کے معاہدہ کی دفعات صحابہ کرام کو "ملی غیرت" کے خلاف معلوم ہوئیں۔ انھوں نے چاہا کہ اسے رد کر دیں اور قریش سے لڑیں۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو امر المسلمین تسلیم نہیں کیا اور لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ اس معاہدہ کو قبول کرلیں۔ فتح مکہ کے بعد مہاجرین نے چاہا کہ مکہ میں اپنے چھوڑے ہوئے مکانوں پر دوبارہ قبضہ کریں۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی امر المسلمین کی حیثیت نہ دی اور مہاجرین کو حکم دیا کہ وہ اپنے

مقبوضہ مکانوں کو اسی حالت میں چھوڑ کر مدینہ واپس چلے جائیں۔ وغیرہ، وغیرہ

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ کسی امر کا امر المسلمین ہونا خدا و رسول کی مرضی سے طے ہوگا نہ کہ خود مسلمانوں کی اپنی خواہشات یا اپنی رایوں سے۔

مسلمانوں کے ساتھ پہلے بھی معاملات پیش آئے ہیں اور آئندہ بھی پیش آئیں گے۔ مگر ان معاملات کے مقابلہ میں مسلمانوں کی روش کیا ہو، اس کا فیصلہ مسلمانوں کی اپنی مرضی سے نہیں ہوگا۔ بلکہ کتاب وسنت کے بے لاگ مطالعہ سے یہ معلوم کیا جائے گا کہ کس معاملہ میں کون سی روش اختیار کی جائے۔

ہندستان کے مسلمان اس وقت دو قسم کے مسائل سے دوچار ہیں۔ ایک، ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے فرقہ وارانہ جھگڑے۔ دوسرا، مسلمانوں کے باہمی اختلافات۔ ان دونوں معاملات میں قرآن وسنت کی واضح رہنمائی موجود ہے۔ مسلم رہنما اگر ان معاملات میں مذکورہ حدیث پر عمل کرنا چاہتے ہیں تو ان کو وہی کام کرنا چاہیے جس کا حکم قرآن وحدیث میں دیا گیا ہے۔

"ہندو مسلہ" کے متعلق بنیادی بات یہ ہے کہ ہندو ہمارے لیے مدعو کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ مدعو ہوں، ان کے بارہ میں حکم ہے کہ ان سے نہ مادی اجر طلب کرو اور نہ ان سے قومی نزاع برپا کرو۔ حتی کہ داعی کے اوپر فرض ہے کہ وہ مدعو کی زیادتیوں سے یک طرفہ طور پر اعراض کرے۔ مگر ہندستانی مسلمان اس کے سراسر خلاف عمل کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں یہاں اہتمام بامر المسلمین یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ روش کی مذمت کی جائے اور ان کو صبر اور اعراض کی روش پر قائم رہنے کی تاکید کی جائے۔

اس کے برعکس اگر مسلم رہنما یہ کریں کہ وہ "ملی مسائل" کے نام پر مسلمانوں کی قومی لڑائی میں شریک ہو جائیں۔ وہ اپنی تقریروں اور اپنے بیانات سے ان کی تصدیق اور ہمت افزائی کرنے لگیں تو یہ واضح طور پر حدیث کے مذکورہ حکم کی خلاف ورزی ہوگی۔

مسلم رہنماؤں پر فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کو بتائیں کہ ہندو ان کے لیے مدعو گروہ کے حکم میں ہیں۔ ان پر لازم ہے کہ وہ ہندوؤں سے قومی اور مادی مسائل پر ہرگز کوئی نزاع نہ چھیڑیں۔ وہ حقوق طلبی کے بجائے محنت کشی پر اعتماد کریں۔ وہ یک طرفہ قربانی کے ذریعہ مسلم اور ہندو کے درمیان تعلقات کو خوشگوار بنائیں تاکہ اس ملک میں دعوتی عمل کا آغاز کیا جا سکے جو مسلمانوں کی مجرمانہ غفلت کے نتیجہ میں صدیوں

سے رکا ہوا پڑا ہے۔

"امرالمسلمین" کا دوسرا پہلو وہ ہے جو مسلمانوں کے باہمی معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ موجودہ مسلمانوں میں باہمی اختلاف اپنے آخری درجہ پر پہنچا ہوا ہے۔ ہر شہر، ہر محلہ، ہر ادارہ میں اس کے مناظر دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہاں مسلم رہنماؤں کو یہ کرنا ہے کہ وہ اس طرح کے معاملات اور نزاعات میں براہِ راست دخل دیں اور ہر ممکن تدبیر استعمال کرکے اس کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔

اس کوشش کا مطلب جلسہ اور تقریر نہیں ہے۔ مسلمانوں کے باہمی نزاعات جلسوں اور تقریروں سے ختم نہیں کیے جاسکتے۔ اس کی شکل صرف ایک ہے۔ اور وہ اسلام کے اصولِ عدل کے مطابق عملی مداخلت ہے۔ مثلاً انھیں معلوم ہوتا ہے کہ فلاں مقام پر ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کے ساتھ غصب اور خیانت کا معاملہ کیا ہے۔ اب تمام مسلم لیڈر وہاں پہونچ کر اس غاصب اور خائن کو پکڑیں۔ اس پر ہر قسم کا قولی اور عملی دباؤ ڈال کر اس کو مجبور کریں کہ وہ اپنے غصب اور خیانت سے باز آئے اور حق کو اس کے حق دار کے حوالے کرے۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما من لم یھتم بامر المسلمین فلیس منھم کا حوالہ دیتے ہیں، مگر وہ مذکورہ بالا دونوں کاموں میں سے کوئی ایک کام بھی نہیں کرتے۔ اس کے برعکس وہ اپنی جھوٹی تقریروں اور سطحی بیانات کے ذریعہ مسلمانوں کی لایعنی قومی مہم میں شریک ہیں۔ یہ صورت حال مذکورہ حدیث کے سراسر خلاف ہے۔ مسلم رہنماؤں نے اگر اپنی موجودہ روش نہ بدلی تو شدید اندیشہ ہے کہ ان کا موجودہ عمل سرکشی اور فساد انگیزی کے خانہ میں لکھا جائے نہ کہ خدا و رسول کے حکم کی بجاآوری کے خانہ میں۔

ضروری اعلان

کشمیر کے غیر معتدل حالات کی وجہ سے ۲۰ اگست ۱۹۸۹ کو سرینگر کا پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔ اس سلسلہ میں جن لوگوں کو تکلیف ہوئی اُن سے ہم معذرت خواہ ہیں۔

ناظم ادارہ

قربانی کا تصور اور ہمارا معاشرہ

عید اضحیٰ کے موقع پر ہر سال جو قربانی کی جاتی ہے، اس کا تعلق انسانی زندگی سے بہت گہرا ہے۔ وہ صحت مند زندگی کی تعمیر کی علامت ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں قربانی ایک سالانہ رسم بن کر رہ گئی ہے۔ اب وہ ایک بے روح مذہبی روایت کے طور پر زندہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ سال کے مخصوص دنوں میں رسمی طور پر جانور تو ذبح کر دیتے ہیں۔ مگر اس کا کوئی اثر ان کی زندگیوں میں نظر نہیں آتا۔ قربانی کا عمل اگر زندہ اسپرٹ کے ساتھ کیا جائے تو ہمارا پورا معاشرہ بالکل بدل جائے۔

قرآن میں قربانی کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اللہ کو اس کا گوشت اور اس کا خون نہیں پہنچتا، بلکہ تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے (الحج ۳۷) گوشت اور خون جانور کے جسم میں ہوتا ہے جس کو ذبح کیا جاتا ہے۔ اور تقویٰ اس آدمی کے دل کی چیز ہے جو ذبح کرنے والا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر اگرچہ جانور کو خدا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، مگر یہ حقیقۃً اپنے آپ کو خدا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں قربانی جانور کا ذبیحہ نہیں بلکہ خود اپنا ذبیحہ ہے۔ یہ ذبح ہونے والے سے زیادہ ذبح کرنے والے کی تصویر ہے۔ بظاہر وہ ایک خارجی عمل ہے مگر باعتبار حقیقت وہ ایک اندرونی عمل ہے۔ اسی شخص کی قربانی صحیح قربانی ہے جس کی ظاہری قربانی اس کی اندرونی قربانی میں ڈھل جائے۔

جانور کو ذبح کرکے آدمی اپنے اس ارادہ کا اظہار کرتا ہے کہ وہ خدا کی خاطر اپنی انا کو ذبح کرے گا۔ وہ اپنے مفادات کو قربان کرکے سچائی کے طریقہ پر قائم رہے گا۔ وہ مصلحتوں کو نظر انداز کرکے خدا کے حکم پر چلنے والا بنے گا۔ اس کا نفس اگر خدا کے راستہ میں چلنے میں رکاوٹ بنے گا تو وہ اپنے نفس پر چھری چلا دے گا مگر خدا کے راستہ سے ہٹنا گوارہ نہیں کرے گا۔

ایک اور مقام پر قرآن میں کہا گیا ہے کہ اللہ کے لئے نماز پڑھو اور قربانی کرو (الکوثر) یہ آیت ایک اعتبار سے، دین کے دو پہلوؤں کو بتاتی ہے۔ ایک عجز و تواضع، اور دوسرے

ایثار و قربانی۔ نماز عجز کی علامت ہے اور جانور کا ذبیحہ قربانی کی علامت۔ یہ گویا دو بنیادیں ہیں جن کے اوپر پورے دین کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔

ایک اعتبار سے اس کو اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کے مقابلہ میں عجز مطلوب ہے، اور بندوں کے مقابلہ میں قربانی درکار ہے۔ اللہ بڑا ہے، ہم چھوٹے ہیں۔ اللہ دینے والا ہے، ہم پانے والے ہیں۔ اللہ آقا ہے۔ ہم اس کے بندے ہیں۔ اس اعتبار سے اللہ کے مقابلہ میں واحد چیز جو مطلوب ہو سکتی ہے، وہ عجز و تواضع ہی ہے۔ یہاں بندے کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے بے کمال ہونے کو مانے، وہ اللہ کے مقابلہ میں عاجزی اور فرماں برداری کا طریقہ اختیار کرے۔

قربانی کا عمل کئی اعتبار سے بندوں سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اس اخلاقی برتاؤ اور انسانی سلوک کا خلاصہ ہے جو قربانی کرنے والے کو اپنے معاشرہ کے اندر پیش آتا ہے۔

قرآن میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت اسماعیل کو ذبح کرنے کے لئے لٹانا چاہا تو حضرت اسماعیل نے اپنے مقدس باپ سے کہا کہ آپ کو خدا کی طرف سے جو حکم ملا ہے، اس کو کر ڈالئے، انشاء اللہ آپ مجھ کو صبر کرنے والا پائیں گے (الصافات ۱۰۲) اس سے معلوم ہوا کہ قربانی کی حقیقت صبر ہے۔ قربانی اس کے بغیر انجام نہیں پا سکتی کہ آدمی پوری طرح صبر و برداشت کرنے والا بن جائے۔ قربانی کرکے آدمی علامتی طور پر اپنے اس ارادہ کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں حضرت اسماعیل کی طرح صبر کرنے والا بنے گا۔

صبر اچھے معاشرہ کی واحد بنیاد ہے۔ صبر کے بغیر کبھی صالح اور صحت مند معاشرہ نہیں بن سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بہت سے آدمی مل کر رہتے ہیں تو ان میں بار بار ایسی باتیں پیش آتی ہیں جو ایک دوسرے کے لئے ناخوشگواری کا باعث ہوتی ہیں۔ ایسا ایک گھر کے اندر بھی ہوتا ہے۔ ایک بستی میں بھی ہوتا ہے اور ایک پوری قوم میں بھی ہوتا ہے۔ ایک کمرہ میں پتھر کے بہت سے اسٹیچو رکھے ہوئے ہوں تو ان کے درمیان آپس میں کبھی ٹکراؤ نہیں ہوگا۔ مگر جہاں زندہ انسان بستے ہوں وہاں اختلاف اور شکایت کا پیش آنا ضروری ہے۔

ایسی حالت میں معاشرہ کو انتشار اور فساد سے بچانے کا واحد راز یہ ہے کہ اس کے افراد

کے اندر صبر کا مادہ ہو۔ لوگ ایک دوسرے کی طرف سے پیش آنے والی ناگواریوں کو برداشت کرلیا کریں۔ لوگ شکایتوں سے اوپر اٹھ کر ایک دوسرے سے معاملہ کریں۔

یہ صبر ہمیشہ قربانی مانگتا ہے۔ قربانی کے بغیر صبر و برداشت کا رویہ ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرہ کے اندر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے رویہ سے کسی کے وقار کو ٹھیس لگتی ہے۔ کسی کا سلوک کسی کی انانیت کو بھڑکا دیتا ہے۔ کسی کی کوئی روش کسی کے لئے اشتعال پیدا کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ ایسے ہر موقع پر گویا آدمی کے اندر ایک حیوان جاگ اٹھتا ہے۔ اب آدمی کو اپنے اندر جاگنے والے اس حیوان کو ذبح کرنا پڑتا ہے۔ اس اندرونی حیوان کی قربانی ہی در اصل حقیقی قربانی ہے۔ کیوں کہ اسی قربانی سے سچی حق پرست زندگی کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہی وہ صالح معاشرہ بنتا ہے جس کو حقیقی معنوں میں صالح اور صحت مند معاشرہ کہا جاسکے۔

اختلاف اور شکایت کے مواقع پر جاگنے والے اندرونی حیوان کو ذبح کرنا ہی وہ اصل قربانی ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔ اس قربانی کو پیش کرکے آدمی اس اعلیٰ عمل کا ثبوت دیتا ہے جس کو قرآن میں تقویٰ (الحج ۳۷) کہا گیا ہے۔

جب آدمی اس نفسیاتی حیوان کی قربانی دیتا ہے، اس کے بعد ہی اس کے اندر وہ مطلوب صفت پیدا ہوتی ہے جس کو صبر کہا گیا ہے۔ صبر و برداشت اور عفو و اعراض صالح معاشرہ کے قیام کے لئے ناگزیر طور پر ضروری ہیں۔ اور یہ صفتیں اندرونی حیوان کو ذبح کرنے کے بعد ہی حقیقی طور پر کسی کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔

قرآن میں قربانی کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ لوگ حج کے لئے آئیں اور چند معلوم دنوں میں ان چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انھیں دئے ہیں۔ پس تم اس میں سے کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو کھلاؤ (الحج ۲۸)

اس آیت سے قربانی کے دو مزید پہلو معلوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ نے جو چیزیں انسان کو دی ہیں، خواہ وہ ذبیحہ کا جانور ہو یا کوئی اور ضرورت کی چیز، ان سب کو استعمال کرتے ہوئے اللہ کا نام لینا ضروری ہے۔ چیزوں کے استعمال پر اللہ کا نام لینا، در اصل اس واقعہ

کا اعتراف کرنا ہے کہ یہ سب چیزیں براہ راست خدا کا عطیہ ہیں۔ اس نے انسانوں کی حاجت اور ضرورت کے لئے یہ تمام چیزیں پیدا کر رکھی ہیں۔ اب ہم سے یہ مطلوب ہے کہ ہم ان کو خدا کا عطیہ سمجھ کر انھیں استعمال کریں نہ کہ ان کو اپنی عقل یا اپنے دست و بازو کا کارنامہ سمجھ لیں۔

قربانی کے موقع پر جو جانور ذبح کیا جاتا ہے، اس کے متعلق حکم ہے کہ اس کو کھاؤ اور کھلاؤ۔ اس طرح قربانی کا عمل آدمی کے اندر فیاضی اور باہمی ہمدردی اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کی اسپرٹ ابھارتا ہے۔ وہ سبق دیتا ہے کہ تم خود کھانے پر اکتفا نہ کرو بلکہ دوسروں کو بھی کھلاؤ۔ تم اپنی کمائی کو صرف اپنی چیز نہ سمجھ لو بلکہ اس میں دوسروں کا بھی حصہ سمجھو۔ تم صرف اپنا معاملہ درست کر کے مطمئن نہ ہو جاؤ بلکہ دوسروں کے معاملات بھی درست کرنے کی کوشش کرو۔ تم ایک انفرادی انسان بن کر نہ رہو بلکہ معاشرہ کے ایک مفید فرد کی حیثیت سے زندگی گزارو۔ تم انسانیت کے کُل کا ایک صالح جزء بن جاؤ۔

ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ قربانی ایک زندہ عمل ہے، نہ کہ محض ایک بے روح قسم کی تاریخی رسم۔ قربانی کا پیغام یہ ہے کہ اپنے وجود کے حیوانی حصہ کو ذبح کرو اور اپنے وجود کے انسانی حصہ کو زندہ کرو۔ یہی قربانی کی اصل حقیقت ہے اور یہی قربانی کا اصل پیغام۔

نوٹ: یہ تقریر ۱۴ جولائی ۱۹۸۹ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

ایک سفر

اپریل ۱۹۶۹ میں میں نے پہلی بار الور (راجستھان) کا سفر کیا تھا۔ اس کے بعد وہاں کے کئی سفر ہوئے۔ اس کا تفصیلی تذکرہ "میوات کا سفر" نامی کتاب میں موجود ہے۔ الور کا موجودہ سفر ۲۰ مئی ۱۹۸۹ کو ہوا، اور ۲۵ مئی کو دوبارہ دہلی کے لیے واپسی ہوئی۔

۵۰۵ سپر فاسٹ اکسپریس شام کو دہلی سے روانہ ہوئی تو ابھی فضا میں اجالا تھا۔ دھیرے دھیرے اندھیرا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ رات آگئی۔ اب ٹرین رات کی تاریکی میں چلنے لگی۔ راستہ میں جب کوئی چھوٹا اسٹیشن آتا تو وہ بالکل سادہ انداز میں آجاتا۔ تاریکی میں چلتے چلتے ہم دیکھتے کہ ٹرین خاموشی سے ایک عمارت میں داخل ہوگئی۔ جہاں چند معمولی روشنیاں بتا رہی ہیں کہ یہ ایک اسٹیشن ہے۔ مگر جب کوئی بڑا اسٹیشن آنے والا ہوتا تو اس کے بہت پہلے سے اس کے آثار دکھائی دینے لگتے۔ عمارتوں اور کارخانوں کے سلسلے نظر آتے۔ اس کے بعد ٹرین کے دونوں طرف روشنیوں کا ہجوم بتاتا کہ ہم ایک بڑے اسٹیشن پر پہونچ گیے ہیں۔

یہی معاملہ چھوٹی یافت اور بڑی یافت کا ہے۔ چھوٹی یافت آدمی کو اس طرح ہوتی ہے کہ اس سے پہلے کوئی بڑی تمہید پیش نہیں آتی۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی سادہ طور پر اس کمرہ سے نکل کر اُس کمرہ میں داخل ہوگیا۔ مگر بڑی یافت ہمیشہ بڑی تمہید کے ساتھ آتی ہے۔ بڑی یافت سے پہلے طوفانی کڑک چمک کے واقعات پیش آتے ہیں۔ آدمی کی زندگی زبردست ہلچل سے دوچار ہوتی ہے۔ آدمی محسوس کرتا ہے کہ اس کا ایک دور دھماکہ کے ساتھ ختم ہوگیا، اور دوسرا دور دھماکہ کے ساتھ شروع ہوگیا۔

جو لوگ معتدل زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ جو اپنے آپ کو بچا بچا کر رکھیں، جو ہر مصلحت کا آخری حد تک لحاظ رکھتے ہوں، ایسے لوگ صرف چھوٹی یافت تک پہونچتے ہیں۔ وہ کبھی بڑی یافت سے آشنا نہیں ہوتے۔ بڑی یافت صرف ان لوگوں کا مقدر ہے جو اپنی زندگی کو طوفانوں میں ڈالیں۔ جو ہیجان خیز لمحات سے دوچار ہونے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ زندگی کے سفر میں چھوٹے اسٹیشن بھی ہیں اور بڑے اسٹیشن بھی۔ یہ مسافر کے اپنے حوصلہ کی بات ہے کہ وہ دونوں میں سے کس

اسٹیشن پر اپنے آپ کو اتارنا پسند کرتا ہے۔

ٹرین میں تقریباً تین گھنٹہ گزارنے کے بعد میں الور پہنچا۔ یہاں اسٹیشن پر مولانا مفتی جمال الدین صاحب اور دوسرے لوگ موجود تھے۔ ان کے ساتھ روانہ ہو کر مدرسہ اشرف العلوم آیا۔ یہاں میرا قیام اسی مدرسہ کے مہمان خانہ میں تھا۔

الور، راجستھان کا ایک قدیم شہر ہے۔ وہ ایک پہاڑ کے دامن میں بسا ہوا ہے جس کے اوپر اب بھی ایک پرانے قلعہ کی عمارتیں دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ قدیم زمانہ میں پہاڑی قلعے حکمرانوں کی حفاظت کا ذریعہ سمجھے جاتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں وہ صرف ایک تاریخی دور کو یاد دلانے کا ذریعہ بن چکے ہیں۔ اگرچہ معاشی دوڑ کی مشغولیت نے بہت کم لوگوں کو اس قابل رکھا ہے کہ وہ ماضی کے ان کھنڈروں کے بارے میں کچھ سوچ سکیں۔

الور ۱۷۷۱ میں راجپوت حکمراں کے قبضہ میں آیا۔ ۱۷۷۵ میں وہ ریاست الور کی راجدھانی بنا۔ ۱۸۰۳ میں الور برٹش اقتدار کے تحت آگیا۔ ۱۹۴۹ سے وہ راجستھان کا حصہ ہے۔

الور کے راجہ ونے سنگھ فارسی اور اسلامیات کے شیدائی تھے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی اور دوسرے علماء عرصہ تک ان کے دربار میں رہے۔ انھوں نے تقریباً ۶۰ سال پہلے دو لاکھ روپیہ خرچ کر کے گلستاں اور بوستاں کا ایک نسخہ تیار کرایا تھا جس پر سنہری کام بنے ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے ۴۰ ہزار روپیہ خرچ کر کے قرآن کا ایک نسخہ تیار کرایا۔ اس قسم کے بہت سے نوادر آج بھی الور کے میوزیم میں موجود ہیں جو زائرین کو گزرے ہوئے ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔

۱۹۳۲ میں مہاراجہ سوائی جے سنگھ (الور) نے اپنی کونسل میں اسپیچ دی تو انھوں نے فارسی اور اردو کے کئی اشعار پڑھے۔ صائب کا ایک شعر یہ تھا:

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد اگر خارے بود گلدستہ گردد

ان کا نظریہ تھا کہ ان کی ریاست میں ہندو اور مسلمان پیار اور محبت کے ساتھ رہیں۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے دلدادہ تھے۔ اپنی اس پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کونسل کی تقریر میں یہ شعر پڑھا:

دنیائے جہاں میں اے یارو جو کوئی رہے دلشاد رہے
گلشن بھی رہے گلچیں بھی رہے بلبل بھی رہے صیاد رہے

مولانا مفتی جمال الدین صاحب نے بتایا کہ ایک بار وہ الور کے ایک ہندو وکیل کے یہاں گیے۔ اس کے دفتر کی دیوار پر ایک خوبصورت فریم تھا۔ اس میں جلی حرفوں میں یہ فارسی شعر لکھا ہوا تھا:

بترس از خدا و میاز ار کس رہِ رستگاری ہمین است و بس

انھوں نے مزید بتایا کہ الور میں ایک بار وہ ایک ہندو دکاندار کے یہاں گیے۔ وہ زیادہ عمر کا تھا اور پرانا زمانہ دیکھے ہوئے تھا۔ اس نے اردو کے بہت سے اشعار سنائے۔ ان میں سے ایک شعر یہ تھا:

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں

الور کے مسافر کو اس طرح کے تاریخی واقعات یہاں کثرت سے سننے کے لیے ملتے ہیں۔ یہ "الور" اور اس طرح کے لاتعداد دوسرے الور ہندستان میں موجود تھے۔ مگر وہ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے نتیجہ میں برباد ہو کر رہ گیے۔ مسلمان ۱۹۴۷ کے انقلاب کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی ناقابل فہم حد تک احمقانہ قیادت کے سوا کوئی نہیں ہے جس کو اس دردناک المیہ کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکے۔ اس نام نہاد قیادت نے مسلمانوں کو دیا کچھ نہیں، البتہ اس کو جو کچھ حاصل تھا اس سے اسے محروم کر دیا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں الور کے تذکرہ کے تحت درج ہے کہ یہاں، دوسری تاریخی عمارتوں کے علاوہ، کئی قدیم مسجدیں بھی پائی جاتی ہیں:

It contain..... several ancient mosques (1/285).

مگر یہ بیان صحیح نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ۱۹۴۷ تک الور میں ایک سو سے زیادہ تعداد میں پر رونق مسجدیں موجود تھیں۔ مگر یہ سب مسجدیں آزادی کے بعد ہونے والے فسادات کی نذر ہو گئیں۔ اب یہاں صرف دو باقاعدہ مسجدیں ہیں جو آزادی کے بعد کے دور میں از سر نو تعمیر کی گئی ہیں۔ ایک، مدرسہ اشرف العلوم کی مسجد، دوسرے، میو بورڈنگ کی مسجد۔ ان کے علاوہ ایک قدیم چھوٹی سی مسجد ہے جہاں ایک "شرر نارتھی" خاندان آباد ہے۔

مولانا محمد ابراہیم صاحب اور مولانا مفتی جمال الدین صاحب ۱۹۴۹ میں دوبارہ الور میں آئے۔ موجودہ جگہ اس وقت چٹیل میدان کی صورت میں تھی۔ صرف کچھ ٹوٹے ہوئے پتھر اس بات کی علامت

تھے کہ یہاں کبھی کوئی عمارت یا کوئی مسجد کھڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے ایک چھپر ڈال کر یہاں تعمیر نو کا آغاز کیا۔

میں پہلی بار اپریل ۱۹۶۹ میں الور آیا تھا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ مولانا ابراہیم صاحب ایک نیم کے درخت کے نیچے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں اور دور چھپے ہوئے مستقبل کو تصوراتی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ۳۰ برس بعد آج یہاں دوبارہ ایک پورا ادارہ کھڑا ہو گیا ہے۔ مسجد اور مدرسہ کی شکل میں اسلامی سرگرمیاں جاری ہیں۔ اس علاقہ میں چونکہ یہ واحد اسلامی ادارہ ہے، اس لیے اطراف کے مسلمان اس سے جڑ گیے ہیں ـــــ ہر بربادی کو دوبارہ آبادی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی بربادی آخری بربادی نہیں۔

۱۹۴۷ سے پہلے کے ہندستان میں یہ روایت تھی کہ مسلم ریاست میں ہندو افسران ہوا کرتے تھے، اور ہندو ریاست میں مسلم افسران۔ الور کا راجہ ایک ہندو تھا، مگر اس روایت کے تحت یہاں کے اکثر بڑے بڑے فوجی اور غیر فوجی عہدے مسلمانوں کے پاس تھے۔ شہر میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۵۰ فی صد تھی۔ بہت سے شعبوں (مثلاً طب، وکالت وغیرہ) پر مسلمانوں کو اجارہ داری حاصل تھی۔ مگر ۱۹۴۷ کا انقلاب آیا تو یہاں سے تمام مسلمانوں کا خاتمہ ہو گیا۔ یہاں کی ۱۰۱ مسجدیں ڈھادی گئیں۔ اب غالباً صرف ایک قدیم مسجد باقی رہ گئی ہے جو ایک "شرنارتھی" کے قبضہ میں ہے۔

ماسٹر ایوب صاحب نے الور کا سول ایریا دکھایا۔ چلتے ہوئے ہم لوگ ایک مقام پر پہونچے جہاں ایک چوک پر اشوک کی لاٹ تھی اور اس کے اندر پارک بنا ہوا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ پہلے اس چوک پر ایک مسجد تھی جو ننگلی والی مسجد کہی جاتی تھی۔ ۱۹۴۷ میں یہ مسجد ڈھادی گئی۔ اس کے بعد جب شہر کا ڈولپمنٹ ہوا تو مسجد کی جگہ پر سڑک بن گئی۔

ماسٹر ایوب صاحب (سابق ایم ایل اے) نے بتایا کہ انھوں نے فروری ۱۹۷۸ میں راجستھان اسمبلی میں اس مسجد کی بابت سوال اٹھایا تھا۔ حکومت کی طرف سے جو تحریری جواب دیا گیا، اس میں کہا گیا تھا کہ مسجد کے گرنے کے بعد وہاں سڑک تعمیر ہو گئی ہے۔ تاہم مسجد کے رقبہ کے بقدر ایک پلاٹ قریب ہی سڑک کے کنارے مسجد کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس پلاٹ کا نمبر بھی انھیں بتایا گیا۔

ماسٹر ایوب صاحب نے کہا کہ وہ پلاٹ میں نے دیکھا تھا اور وہ پانچ سال سے زیادہ مدت تک مسجد کے نام پر خالی پڑا رہا۔ مگر مسلمان اس کو استعمال نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ حسب قاعدہ ضروری مدت

گزرنے کے بعد حکومت نے وہاں اپنی تعمیرات کرالیں ——— موجودہ زمانہ کے مسلمان کھوئے ہوئے مواقع کے لیے فریاد کرنے میں سب سے آگے ہیں مگر ملے ہوئے مواقع کو استعمال کرنے میں وہ سب سے پیچھے ہوگیے ہیں۔

مولانا محمد حنیف خاں صاحب (پیدائش ۱۹۵۲) الرسالہ کے مستقل قاری ہیں اور اس کے نقطۂ نظر سے مکمل اتفاق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کئی تجربات بتائے۔ ان میں سے دو یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

لال داس کی درگاہ (شیر پور) میں لال داس کی قبر ہے۔ ہندو ان کو ہندو کہتے ہیں۔ اور مسلمانوں کا کہنا ہے کہ وہ مسلمان تھے۔ اس درگاہ کے احاطہ میں تین مسجدیں بھی ہیں۔ جولائی ۱۹۸۶ میں یہاں جھگڑے کی صورت پیدا ہوگئی۔ کچھ مسلمانوں نے یہاں کی ایک مسجد میں لاؤڈ اسپیکر لگا کر اذان دی اور نماز باجماعت ادا کی۔ اس پر ہندوؤں کو اعتراض ہوا اور دونوں فرقوں میں لڑائی کی نوبت آگئی۔

الور کے ہندی اخباروں (خاص طور پر الور بازار پتریکا) نے خبر کو اس انداز میں شائع کیا کہ مسلمانوں نے لال داس جی کے مندر پر قبضہ کر لیا اور اس کے اندر گھس کر زبردستی نماز پڑھی۔ اور ہندوؤں کو مار پیٹ کر بھگا دیا۔ یہ خبریں چھپیں تو الور میں حالات بگڑ گیے اور فساد کی صورت پیدا ہوگئی۔ ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگا کہ شیر پور میں مسلمانوں نے ہندوؤں پر ظلم کیا ہے۔

اس موقع پر مقامی مسلمانوں نے صحیح حالات مرتب کر کے مقامی ہندی اخباروں میں چھپوانا چاہا۔ مگر اخباروں نے ان کے بیانات نہیں چھاپے۔ ہندوؤں سے ملاقات کر کے زبانی وضاحت کی کوشش کی گئی تو وہ بھی بے فائدہ ثابت ہوئی۔ اس وقت کچھ مسلمانوں نے قومی ایکتا منچ کی میٹنگ کی۔ اس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور سکھ لوگ بھی شریک ہوئے۔

تاہم منچ کی میٹنگ میں کوئی بات طے نہ ہو سکی۔ لوگوں کے ذہنوں میں ہندی اخبارات میں چھپنے والی رپورٹیں اور افواہیں چھائی ہوئی تھیں۔ آخر میں کچھ مسلمانوں نے یہ تجویز پیش کی کہ قومی ایکتا منچ کے کچھ ذمہ دار افراد شیر پور جائیں۔ وہ اپنے ساتھ ایک پتر کار (اخبار نویس) اور فوٹو گرافر بھی لے جائیں۔ وہ براہ راست معلومات کے ذریعہ رپورٹ تیار کریں اور جائے وقوع کا فوٹو بھی لیں۔

اس کے بعد قومی ایکتا منچ کے تحت ایک وفد شیر پور گیا۔ وہاں اس نے براہ راست مشاہدہ کیا اور تصویریں لیں۔ واپس آکر انھوں نے ہندی اخبار ارن پربھا میں مفصل رپورٹ شائع کی۔ انھوں نے بتایا کہ لال داس کی درگاہ میں باضابطہ مسجدیں ہیں اور وہاں مسلمانوں کی قبریں ہیں۔ انھوں نے مسجدوں کی تصویریں بھی چھاپیں۔ الور کے ہندوؤں نے جب اس باتصویر رپورٹ کو پڑھا تو اچانک ان کا ذہن بدل گیا۔ ہر ایک یہ کہنے لگا کہ آر ایس ایس والے ہی غلط ہیں۔ وہ جھوٹا جھگڑا کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ لوگوں نے مان لیا کہ مسلمانوں نے کسی مندر پر قبضہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ مسجد کے اندر پرامن طور پر نماز پڑھی ہے۔

ہندی اخباروں کی خبروں اور افواہوں کے خلاف یہاں کے مسلمان اگر مشتعل ہوتے اور تعصب کی شکایتیں کرتے رہتے تو یقیناً الور میں فساد ہو گیا ہوتا۔ مگر جب انھوں نے دانش مندانہ تدبیر کی تو فرقہ وارانہ آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ اور فرقہ وارانہ فساد کے دہانہ پر پہنچنے کے باوجود الور فساد سے بچ گیا۔

مولانا محمد حنیف خاں صاحب نے میو بورڈنگ (الور) کا واقعہ بتایا۔ وہ میو بورڈنگ کی مسجد میں امام اور خطیب ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۸۳ میں یہاں بورڈنگ کے سامنے مسلمانوں نے کچھ چھوٹی چھوٹی دکانیں لگالیں۔ میونسپل کمیٹی کے لوگوں کو اس پر اعتراض ہوا کہ یہ سرکاری جگہ پر بلا اجازت بنائی گئی ہیں۔ انھوں نے پولیس کی مدد سے دکانیں ہٹوادیں۔ میوؤں کا ایک وفد کلکٹر کے پاس فریاد لے کر گیا۔ مگر کلکٹر نے ان کو سخت جواب دے کر واپس کر دیا۔

اس کے بعد کچھ مسلمانوں نے دوسری تدبیر کی۔ انھوں نے ہندو طلبہ (مینا برادری اور جاٹ برادری) کی ایک تعداد کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ یہ جو واقعہ ہوا ہے اس کو صرف میوؤں کا واقعہ نہ سمجھئے۔ آج جو کچھ میوؤں کے ساتھ ہوا ہے، وہی کل خود آپ کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات ہندو طلبہ کی سمجھ میں آگئی۔ وہ فوراً کلکٹر کے پاس گیے۔ کلکٹر نے انھیں بھی سخت جواب دیا۔ طلبہ نے کلکٹر سے کہا کہ اس کو آپ چند نوجوانوں کی بات نہ سمجھیں۔ الور کے سات ہزار اسٹوڈنٹ ہمارے پیچھے ہیں۔ آپ اگر سختی کرتے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کو سات ہزار اسٹوڈنٹ سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ اور اس معاملہ میں ہندو مسلمان سب ایک ساتھ ہوں گے۔ یہ دھمکی سن کر کلکٹر دب گیا اور سابقہ حکم کو واپس لے لیا۔

اس طرح کے مواقع پر مسلمان اکثر ایسا کرتے ہیں کہ وہ پولیس سے خود لڑ جاتے ہیں۔ اگر وہ ایسا کریں کہ خود لڑنے کے بجائے برادرانِ وطن کو سامنے کر دیں تو صورت حال یکسر بدل جائے گی۔ اس ملک میں

مسلمانوں کی ہار کی تاریخ جیت کی تاریخ بن جائے گی۔

مذکورہ واقعہ کوئی استثنائی واقعہ نہیں۔ اس طرح کے چھوٹے بڑے واقعات ہر روز اور ہر جگہ پیش آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو اس ملک میں کسی بھی شخص کے لیے زندگی بالکل ناممکن ہو جائے۔

مگر مسلم رہنما اس قسم کے واقعات کا چرچا نہیں کرتے اور نہ مسلمانوں کے اخبارات ان کو اپنے صفحات میں نمایاں کرتے۔ ہمارے رہنما اور ہمارے اخبارات دونوں صرف ان واقعات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں کہ جو بڑھتے بڑھتے گولی اور فساد تک پہونچ جائیں۔ اگرچہ فساد تک نہ پہونچنے والے واقعات سو میں ۹۹ ہوتے ہیں اور فساد تک پہونچنے والے واقعات سو میں صرف ایک ——— "فساد ہو گیا" کی خبر ہر ایک کو معلوم ہے، مگر "فساد ہوتے ہوتے رہ گیا" کی خبر کسی کو معلوم نہیں۔

یہ کوئی سادہ سی بات نہیں۔ یہ مسلمانوں کے اندر ایک مہلک بیماری کا پتہ دیتی ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ مسلمانوں کا بگاڑ اس حد تک پہونچا ہے کہ اب انھوں نے مثبت ذہن کو کھو دیا ہے۔ وہ منفی نفسیات میں جینے والی ایک قوم بن گیے ہیں۔ بغض اور نفرت اور انتقام ان کی روح کی غذا ہیں۔ محبت، درگزر، انسانیت دوستی کی خبروں میں ان کی روح کے لیے کوئی غذا نہیں۔

الور کے متعلق عام شہرت یہ ہے کہ وہ ایک سخت متعصب علاقہ ہے۔ مگر اس طرح کی باتیں ہمیشہ جنرلائزیشن ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں تعصب ہو وہیں انصاف بھی موجود ہوتا ہے۔

یہاں لوگوں نے بتایا کہ مسٹر آروند مایا رام (IAS) الور میں کلکٹر ہو کر آئے۔ وہ نہایت منصف مزاج آدمی تھے۔ انھوں نے یہاں کے مسلمانوں (میوؤں) کو اٹھانے کے لیے بہت کام کیا۔ انھیں کی وجہ سے مدرسہ اشرف العلوم کو موجودہ قیمتی زمین رعایتی قیمت پر مل سکی جب کہ وہ محکمہ ریلوے کے قبضہ میں جا چکی تھی۔ وغیرہ، وغیرہ۔ مسٹر آروند مایا رام ڈھائی سال تک الور میں رہ کر ۱۹۸۸ میں یہاں سے چلے گیے۔ آج کل وہ دہلی میں ہیں۔

ایک مجلس میں ایک صاحب رعایت اور ریزرویشن کی بات کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس ملک میں مسلمان اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے کہ ان کو ریزرویشن دیا جائے اور ان سے رعایت والا معاملہ کیا جائے۔

میں نے کہا کہ یہ معاملہ سادہ طور پر رعایت مانگنے کا نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ یہ خدا کی طرف سے

مایوسی کا اظہار ہے۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ آپ کے پیدا کرنے والے نے آپ کو کچھ نہیں دیا، اب آپ انسانوں سے مانگ کر اپنی محرومی کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔

۲۱ مئی کی شام کو مدرسہ میں کچھ مقامی تعلیم یافتہ اصحاب جمع ہوگئے۔ مسلمانوں کی تعلیم کے موضوع پر گفتگو ہونے لگی۔ میں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمان تعلیم میں پیچھے ہوگئے ہیں۔ ہمارے رہنما اس کی ذمہ داری انگریزوں کی سازش اور ہندوؤں کے تعصب پر ڈالتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک اس کی تمام تر ذمہ داری خود مسلم رہنماؤں کے اوپر ہے۔

موجودہ زمانہ میں ملک کے اندر بے شمار اسکول اور کالج کھلے۔ انھیں عیسائیوں اور ہندوؤں نے قائم کیا تھا۔ مگر مسلمان تحفظ کے ذہن کے تحت اس سے دور رہے۔ انھوں نے کہا کہ دوسری قوموں کی طرف سے ہمارے اوپر تہذیبی حملہ ہو رہا ہے، ہمیں اس سے بچاؤ کی فکر کرنا چاہیے۔ بہت سے لوگوں نے ان اسکولوں اور کالجوں کو مسلمانوں کے لیے "قتل گاہ" بتایا۔ اکبر الہ آبادی نے ان پر طنز کرتے ہوئے کہا:

بچوں کے کبھی قتل سے بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

یہ فکر میرے نزدیک سراسر لغو تھا۔ بعد کے تجربات بتاتے ہیں کہ انھیں اسکولوں اور کالجوں سے بے شمار لوگ ہماری دینی جماعتوں کو ملے۔ اگر یہ ادارے واقعۃً قتل گاہ ہوتے تو یہ تمام لوگ ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے قتل ہو چکے ہوتے، پھر وہ ہماری دینی جماعتوں کو کیسے ملتے۔

میں نے کہا کہ اصل مسئلہ تحفظ اور بچاؤ کا نہ تھا بلکہ جوابی فکری اقدام کا تھا۔ ضرورت یہ تھی کہ اسلام کی تعلیمات کو جوابی نظریہ کی حیثیت سے پیش کیا جائے اور مسلمانوں کی نئی نسلوں میں اسلام پر اتنا یقین اور حوصلہ پیدا کر دیا جائے کہ وہ جدید تہذیبی حملوں کے مقابلہ میں پر عزم طور پر ٹھہر سکے۔

میں نے کہا کہ ہمیں ملک کے تعلیمی نظام سے کٹنا نہیں تھا، بلکہ اپنی نسلوں کو ان اداروں میں پڑھاتے ہوئے ان کی ذہنی تعمیر کا کام کرنا تھا۔ اس طرح کے کام کی ایک مثالی تبلیغی جماعت ہے۔ تبلیغی جماعت کا کام اگرچہ خالص روایتی انداز میں چل رہا ہے، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ یہی ہے۔ وہ فکر کا جواب فکر سے دیتی ہے۔ مادی تہذیب کے پرستاروں کا کہنا تھا کہ "چیزوں سے ہوتا ہے"۔ اس کے جواب میں تبلیغ نے کہا کہ "چیزوں سے نہیں خدا سے ہوتا ہے"۔ یہ گویا

ایک نظریہ کے جواب میں دوسرا نظریہ تھا۔ اس جوابی نظریہ نے بہت سے زیر تعلیم نوجوانوں کو متاثر کیا اور وہ مادی فکر سے کٹ کر دینی فکر سے جڑ گیے۔

محمد حنیف خاں صاحب نے بتایا کہ "میوات کا سفر" نامی کتاب میں نے پڑھی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ اس کتاب کے بارے میں بعض میواتیوں نے اس تاثر کا اظہار کیا ہے کہ اس میں میوؤں کی خرابیوں کا ذکر ہے، مگر اس میں ان کی اچھائیوں کا ذکر نہیں۔

محمد حنیف خاں صاحب جو خود بھی ایک میو ہیں، انھوں نے کہا کہ میرا تاثر اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں نے یہ کتاب (میوات کا سفر) دو مہینہ پہلے پڑھی ہے۔ اس کو پڑھنے سے پہلے میں میوؤں کے مستقبل کے بارے میں مایوس تھا۔ اس کتاب کو پڑھ کر میری مایوسی امید میں بدل گئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے خیال میں یہ تبدیلی کیسے آئی۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب میں بیک وقت دو باتیں ہیں۔ ایک بالفعل، دوسرے بالقوہ۔ میوؤں کی بالفعل تصویر تو وہی ہے جس کا نقشہ اس کتاب میں دکھایا گیا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بات بھی اس میں بہت طاقتور انداز میں بتائی گئی ہے کہ میوؤں کے اندر بالقوہ صلاحیت نہایت اعلیٰ سطح پر موجود ہے، اگر ان کے بالقوہ کو بالفعل بنایا جاسکے تو وہ اسی طرح شاندار ترقی کر سکتے ہیں جس کی ایک مثال موجودہ جاپان میں نظر آتی ہے۔

۲۴ مئی ۱۹۸۹ کو سیلی بیرٹھ، سارسکا اور ٹائیگر ڈین دیکھے۔ یہ سفر محمد چاولہ خاں صاحب کی معیت میں ہوا۔ یہ سب راجہ کے محل تھے، اور اب وہ ہوٹل میں تبدیل کر دیئے گیے ہیں۔ تینوں محل پہاڑوں اور قدرتی مناظر کے درمیان ہیں۔ وہاں پہونچ کر آدمی کچھ دیر کے لیے ماحول کی خوبصورتی میں گم ہو جاتا ہے۔

تاہم یہ تفریح بے حد وقتی ہے۔ ہم ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چاروں طرف مسحور کن قدرتی مناظر پھیلے ہوئے تھے۔ خود ہوٹل کا تعمیری حسن بھی غیر معمولی تھا۔ ہوٹل کا منیجر ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا۔ میں نے بات کرتے ہوئے پوچھا کہ موجودہ جاب آپ کے لیے کیسا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سخت بورنگ۔ میں تو اس کو ایک پنشمنٹ سمجھتا ہوں۔ کوئی آدمی جب یہاں آتا ہے تو ایک دو دن کے لیے تو اس کو یہاں کا ماحول بہت اچھا لگتا ہے۔ اس کے بعد وہ بور ہو کر بھاگ جانا چاہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نیا پن کا نام زندگی ہے، اور یکسانیت کا نام موت۔ انسان کسی جامد چیز سے مستقل طور پر محظوظ نہیں ہو سکتا۔ مستقل طور پر محظوظ ہونے کے لیے ایک ایسی چیز درکار ہے جو ارتقا پذیر ہو۔ ایسا مقام صرف جنت ہو سکتا ہے۔ دنیا میں اس قسم کی لذت گاہ کا حصول ممکن نہیں۔

۲۱ مئی کو مفتی جمال الدین صاحب کی صاحبزادی کے نکاح کی تقریب میں شرکت کی۔ الور سے تقریباً ۵۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر کیما سا نامی گاؤں کا سفر ہوا۔ سفر کا نصف حصہ الور۔ دہلی روڈ پر طے ہوا۔ سڑک دونوں طرف سے اونچے درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ جنّتین عن یمین وشمال کا منظر تھا۔ یہ پورا سفر سرسبز چھتری کے نیچے ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ عجیب وغریب احسان یاد آیا۔ اس دنیا میں ہر کثیف چیز اوپر سے نیچے کی طرف جاتی ہے۔ درخت واحد استثناء ہے جو نیچے سے اوپر کی طرف جاتا ہے۔ درخت کی یہی خصوصیت ہے جس کے نتیجہ میں یہ ممکن ہوا کہ وہ ہمارے راستوں کے اوپر سرسبز چھتری بن کر سایہ فگن ہو سکے۔ درخت میں اگر یہ استثنائی صفت نہ ہوتی تو زمین پر سرسبز میدان تو ہوتے مگر سرسبز سائے ہم کو نصیب نہ ہوتے۔

صبح ۸ بجے جدید طرز کی ماروتی وین قدیم طرز کے کیما سا میں داخل ہوئی۔ دل نے کہا کاش یہ واقعہ میوؤں کی قدیم زندگی میں جدید امکانات کے داخلہ کی علامت بن جائے۔ ۲۰ سال پہلے راقم الحروف نے "میوات کے سفر" میں میوات کی جو تصویر دیکھی وہ تقریباً مکمل طور پر روایتی تھی۔ آج اس قدامت میں جدت کی کچھ نشانیاں نظر آنے لگی ہیں۔ مگر ابھی وہ اتنی کم ہیں کہ وہ صرف اس زمرہ میں جاتی ہیں جس کے متعلق غالب نے کہا تھا:

دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

گاؤں کی مسجد میں نکاح کی سادہ تقریب ہوئی۔ قاضی صاحب نے رجسٹر نکاح بھرتے ہوئے پوچھا کہ مہر کتنی رکھی جائے۔ نوشہ (محمد الیاس ۲۲ سال) کے والد نے کہا ۳۲ ½ تولہ چاندی رکھ لو۔ معلوم ہوا کہ میوؤں میں سیکڑوں سال سے یہ روایت چلی آرہی ہے کہ ساڑھے ۳۲ تولہ چاندی مہر نکاح مقرر کرتے ہیں۔ اس قسم کی روایت کسی گروہ کے لیے بہت قیمتی ہے۔

مجھے یاد آیا کہ چند روز پہلے نئی دہلی میں ہمارے دفتر کے سامنے والے پارک میں ایک شادی کی تقریب تھی۔ پارک میں بہت بڑا شامیانہ لگایا گیا۔ روشنیوں کی کثرت سے نگاہ ٹھیرانا مشکل تھا۔

ساری رات لاؤڈ اسپیکر سے گانے کی آوازیں آتی رہیں۔ رات بھر رسوم ادا کرنے کے بعد صبح ہوئی تو شادی والے اور شامیانہ والے میں تکرار ہوگئی۔ شامیانہ والا ۵۰ ہزار روپیہ مانگ رہا تھا۔ شادی والے کا کہنا تھا کہ ۴۵ ہزار میں بات طے ہوئی تھی۔

قاضی صاحب "جو انسان سے نہ چاہے وہ خدا سے پاتا ہے" سب سے بڑی دولت استغنا ہے۔

کیماسہ کی آبادی تقریباً ایک ہزار ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے یہاں اور علاقہ کے دوسرے مقامات پر زیادہ تر میو (مسلمان) آباد تھے۔ وہی یہاں غالب حیثیت رکھتے تھے۔ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد بیشتر میو یہاں سے چلے گیے۔ زمینیں تقریباً سب کی سب شرنارتھیوں کو دے دی گیں۔ تھوڑے سے میو جو یہاں باقی تھے ان کی حیثیت زرعی مزدور کی ہوگئی۔ ان میوؤں کے لیے زندگی کی صورت صرف یہ تھی کہ وہ شرنارتھیوں کی زمینوں پر محنت کرکے اپنی معاش حاصل کریں۔

مگر شرنارتھی یہاں جم نہ سکے۔ ان کے اندر شہر جانے کا ذہن ابھرا۔ وہ اپنی زمینوں کو بیچ کر شہروں کی طرف منتقل ہونے لگے۔ اب میوؤں کی باری تھی۔ انھوں نے ان زمینوں کو شرنارتھیوں سے خریدنا شروع کردیا۔ اس طرح یہاں کی زمینیں اب دوبارہ میوؤں کے قبضہ میں آچکی ہیں۔

دس سال پہلے جب میں یہاں آیا تھا تو میوؤں کو یہ شکایت کرتے ہوئے سنا تھا کہ ہماری زمینیں شرنارتھیوں کے قبضہ میں چلی گئیں۔ مگر اب دس سال بعد دوسرا سفر ہوا تو تاریخ بدل چکی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگ اپنی عجلت پسندی کی وجہ سے آنے والے وقت تک انتظار نہیں کر پاتے۔ لوگ اگر کل کے امید افزا حالات کو جانیں تو وہ کبھی آج کے مایوس کن حالات پر دل شکستہ نہ ہوں۔

یہاں کی مسجد دوبارہ زیادہ بہتر اور وسیع انداز میں تعمیر کی جارہی ہے۔ ۲۵ مئی کو صبح روانگی سے پہلے میں مسجد کے اندرونی حصہ میں کھڑا ہوا اس کی تعمیرات کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ قدیم مسجد پہلی بار ۱۹۴۷ میں مکمل طور پر ڈھادی گئی تھی۔ اس کے بعد اس کی نئی تعمیر ہوئی۔ یہ نئی تعمیر بھی دوبارہ ۱۹۸۸ میں پوری کی پوری ڈھادی گئی۔

میں نے سوچا کہ "ڈھانے" کے اعتبار سے ۱۹۴۷ کا واقعہ اور ۱۹۸۸ کا واقعہ، دونوں بظاہر یکساں ہیں۔ مگر نوعیت کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ پہلا واقعہ

دشمنوں نے کیا تھا، دوسرا واقعہ دوستوں نے کیا ہے۔ پہلا انہدام مسجد کو ختم کرنے کے لیے تھا، دوسرا انہدام مسجد کو ازسرِنو زیادہ بہتر بنانے کے لیے۔ اس دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دو چیزوں کی شکل بظاہر یکساں ہوتی ہے۔ مگر دونوں کی حقیقت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ جو لوگ اس راز کو نہ جانیں، وہ کبھی اس دنیا میں کامیاب روش اختیار نہ کر سکیں گے۔

جس مدرسہ میں میرا قیام تھا، اس سے اسٹیشن قریب ہے۔ یہ سفر میں نے بالقصد سائیکل رکشہ کے ذریعہ کیا۔ اسٹیشن پہونچ کر رکشہ والے سے کرایہ پوچھا تو اس نے دو روپیہ بتایا۔ میں نے فوراً اس کو دو روپیہ دیا اور اسٹیشن میں داخل ہو گیا۔ یہاں مدرسہ کے لوگوں سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ ہم نے رکشہ والے کو کرایہ کی رقم ادا کر دی تھی۔ اس قصہ کو سن کر مدرسہ کے ایک استاد حافظ محمد اسماعیل صاحب (۳۵ سال) بولے: دو روپیہ لے جانے سو کون سا اس کا رکشہ چلانا چھوٹ جائے گا۔ چلائے گا تو وہ رکشہ ہی۔

ہماری ٹرین (سپر فاسٹ اکسپریس) الور اسٹیشن پر پہونچی تو وہ پندرہ منٹ لیٹ تھی۔ مگر دہلی پہنچتے پہنچتے وہ پورے ایک گھنٹہ لیٹ ہو گئی۔ اس کی وجہ ایک مسافر نے اپنے لفظوں میں اس طرح بتائی: لیٹ ہونے کے بعد پٹتی جاتی ہے گاڑی۔ جو ٹرین ایک بار لیٹ ہو جائے تو اس کو مزید لیٹ ہونا پڑتا ہے۔ کیوں کہ ریلوے کا اصول یہ ہے کہ جو ٹرین اپنے صحیح وقت پر چل رہی ہو اس کو پہلے راستہ دیا جائے۔ اور جو ٹرین لیٹ ہو گئی ہو اس کو روک دیا جائے۔ چنانچہ آگے سے آنے والی ٹرین کو راستہ دینے کی خاطر ہماری ٹرین بار بار درمیانی اسٹیشنوں پر روکی جاتی رہی۔ اس طرح ایسا ہوا کہ جو گاڑی ابتدا میں پندرہ منٹ لیٹ تھی وہ آخر میں ایک گھنٹہ لیٹ ہو گئی۔

یہی وسیع تر زندگی کا معاملہ ہے۔ جو زندگی کی دوڑ میں ایک بار پیچھے ہو جائے وہ مزید پیچھے ہوتا چلا جائے گا، خواہ اس نے اپنی سواری کا نام "سپر فاسٹ" کیوں نہ رکھ لیا ہو۔

ٹرین مجھے لیے ہوئے الور سے دہلی کی طرف جا رہی تھی۔ ذہن میں مختلف قسم کے خیالات گردش کر رہے تھے۔ میرے سامنے کی سیٹ پر ایک عورت اپنی چھوٹی بچی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک میں نے سنا کہ بچی اپنی ماں سے کہہ رہی ہے: ممی، نانی کا گھر کب آئے گا۔

میں نے سوچا کہ بے خبر بچی صرف اپنی نانی کو جانتی ہے۔ وہ سمجھ رہی ہے کہ وہ نانی کے گھر

جارہی ہے۔ حالانکہ بچی اور دوسرے تمام مسافر حقیقۃً "خدا کے گھر" کی طرف جارہے ہیں۔ دہلی ہمارا درمیانی اسٹیشن ہے نہ کہ آخری اسٹیشن۔

یہ سوچتے ہوئے ایسا محسوس ہوا گویا کہ میں ٹرین پر نہیں ہوں، بلکہ کسی خدائی سواری پر بیٹھا ہوا ہوں۔ خدا کے فرشتے مجھے دنیا سے آخرت کی طرف لے جارہے ہیں۔ ۲۵ مئی کی صبح کو جب ٹرین دہلی اسٹیشن پر رکی تو چھوٹی بچی کے لیے وہ "نانی کا گھر" تھا جس کی نانی اس کا استقبال کرنے کے لیے پہلے سے اسٹیشن پر موجود تھی۔ مگر میرے لیے وہ "خدا کا گھر" تھا جہاں خدا کے فرشتے ہر آنے والے کو اپنے قبضہ میں لے رہے تھے۔

آج کی دنیا میں ہر آدمی مذکورہ چھوٹی بچی کی مانند ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی "نانی کے گھر" جارہا ہے۔ حالاں کہ وہ "خدا کے گھر" کی طرف جارہا ہے۔ وہ استقبال کے اسٹیشن پر نہیں بلکہ احتساب کے اسٹیشن پر اترنے والا ہے۔ کتنا زیادہ فرق ہے لوگوں کی سوچ میں اور اصل حقیقت واقعہ میں۔

دینِ کامل

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۳۶۸

ہدیہ ۴۰ روپیہ

قرآن میں اسلام کو دینِ کامل کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام دینِ مستحکم ہے۔ اسلام کا ظہور، دینِ خداوندی کی تاریخ میں ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہے۔ اسلام نے خدا کے دین کے ساتھ انسانی تعدی کے دور کو ختم کر دیا اور دین کو تمام پہلوؤں سے کامل کر کے اس کو ایسا مستحکم بنا دیا کہ قیامت تک اس کی برتری باقی رہے وہ اپنے پیروؤں کے لیے ابدی سرفرازی کی ضمانت بن جائے۔

خبرنامہ اسلامی مرکز — ۵۴

۱- ۱۴ جولائی ۱۹۸۹ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔ اس تقریر کا عنوان تھا: ایثار اور قربانی کی تجدید کا دن۔ اس تقریر میں بتایا گیا کہ عید اضحیٰ کا دن اس حقیقت کو یاد دلانے کا دن ہے کہ افراد کی قربانی سے انسانیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ اگر افراد قربانی کے لیے تیار نہ ہوں تو انسانیت کی اعلیٰ ترقی بھی ممکن نہیں۔

۲- دہلی کے انگریزی اخبار اسٹیٹسمین نے اپنے شمارہ ۱۲ جون ۱۹۸۹ میں اپنے کرسپانڈنٹ کے حوالہ سے ایک نوٹ شایع کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے: Unusual Maulana اس نوٹ کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

Delhi-based Maulana Wahiduddin Khan was in the news recently. His book *Muhammad the Prophet of Revolution*, has been acclaimed on both sides of the border. The Maulana was born in a well-to-do Zamindar family of U.P., of which he sadly saw little. His father died at a young age and the "Zamindari", as of yore, went into litigation. But his mother, choosing to leave litigation to the "court above" took charge of the family a la Gorky's Mother. She has obvioulsly contributed a lot to the Maulana's upbringing — and a good upringing it indeed has been. The Maulana believes in his God, that's what his mother taught him. He believes in staying away from the limelight, in quiet constructive work, individually and collectively. It is really remarkable how a village boy who grazed livestock in the tradition of the prophet turned to theology and other subjects and went on to write in English, Urdu and Hindi. Some of his works have been translated into the major languages of the world. He is the only Maulana I have heard speak about the big bang theory, start a purely religious address with an example of Gandhi and show the eagerness of a child to know how exactly an aeroplane flies — aero-dynamics and all. But then he is the only Maulana who draws turbaned Sardars in the front row along with the Hindus in his religious discourses. The composition of his audiences does not influence the substance of his talk one way or the other. What we need today is more and more Maulana Wahiduddins and less and less Shahabuddins and Bukharis.

۳- سیکولر ڈیموکریسی (قومی ایکتا ٹرسٹ) کے تحت ۲۴ جون ۱۹۸۹ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ایک راونڈ ٹیبل ڈسکشن ہوا۔ اس کا موضوع روس میں جمہوریت تھا (Soviet experiment with democracy)۔ صدر اسلامی مرکز کو اس میں شرکت اور اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ مگر بعض مصروفیات کی وجہ سے ان کی شرکت ممکن نہ ہو سکی۔ البتہ موضوع سے متعلق کچھ لٹریچر منتظمین کے پاس بھیج دیا گیا۔

۴۔ مئی ۱۹۸۹ کے آخری ہفتہ میں صدر اسلامی مرکز نے الور اور میوات کے بعض دیہاتوں کا سفر کیا۔ اس کا سفر نامہ لکھ لیا گیا ہے۔ آئندہ انشاء اللہ کسی شمارہ میں شائع کیا جائے گا۔

۸۔ ۸-۹ جولائی ۱۹۸۹ کو دہلی میں "مسلم سیاسی کنونشن" ہوا۔ اس کنونشن کے داعی مبینہ طور پر الرسالہ مشن کے مخالف ہیں۔ مگر ماؤلنکر ہال جہاں اس کنونشن کی دو روزہ کارروائیاں ہوئیں، اس کے گیٹ پر شرکت کرنے والی ایک مسلم تنظیم کی جانب سے ایک بینر لگا ہوا تھا جس پر نمایاں طور پر لکھا ہوا تھا: "اتحاد کیا ہے، اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہنا" یہ پیغام واضح طور پر الرسالہ کا پیغام ہے۔ مذکورہ مسلم کنونشن میں اس پیغام کے بینر کا ہونا بتاتا ہے کہ الرسالہ کا مشن خدا کے فضل سے اب اتنا پھیل چکا ہے کہ اس کی گونج اس کے مخالفین کے کیمپ میں بھی سنائی دیتی ہے۔

۹۔ ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ (عمر ۸۳ سال) علامہ اقبال کے شاگرد ہیں۔ اور کلکتہ میں رہتے ہیں۔ وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ نیز انھوں نے اسلامی مرکز کی مطبوعات بھی پڑھی ہیں۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: واقعی اس دور میں اسلام جیسے دین کامل کو صحیح طور پر پیش کرنے کا سہرا الرسالہ کے سر ہے۔ ورنہ جس قدر غلط تعبیرات کا نشانہ اسلام رہا ہے کوئی اور نہیں رہا۔ آپ کی نیک کوششوں نے اس کا ازالہ کیا ہے۔ جہاں کہیں بھی کسی مسلم مجلس میں مجھے جانے کا موقع میسر ہوتا ہے تو میں آپ کی نیک کوششوں کا ذکر ضرور کرتا ہوں۔ آپ نے واقعی اسلام کو اسلام بنا دیا ہے۔ اور ہر شخص آپ کے اور آپ کے پیش کردہ اسلام کی تعبیر کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔

۷۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: اللہ اکبر کا مطالعہ کیا۔ اس سے پہلے اسلام دین فطرت وغیرہ کا بھی مطالعہ کر چکا ہوں۔ ۱۹۸۰ میں جب میں کالج میں پڑھ رہا تھا، علامہ اقبال کا یہ شعر ——— "سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر" میری نظر سے گزرا۔ مگر آج تک میری لالہ و گل سے ملاقات نہ ہوئی۔ الحمد للہ آپ کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد میں نے کائنات کے ذرہ ذرہ سے بات کرنے کا طریقہ سیکھا۔ ایک زمانہ تھا جب میں نے کتاب "خطبات" پڑھی۔ اس نے مجھے یہاں تک پہونچایا کہ اسلام ایک سیاسی نظام کے سوا کچھ نہیں ہے۔ نماز، روزہ، زکوۃ

حج اسی سیاسی عمارت کے کھمبے ہیں۔ علامہ اقبال نے مجھے ایک طوفانی سمندر میں ڈالا جہاں لہروں کے ساتھ لڑنا اور پھر ہلاک ہونے کے سوا کچھ اور نہیں۔ آپ نے مجھے ایک ایسی کائنات دکھائی جہاں ہر ایک شئے ذرہ سے ستاروں تک قانون الٰہی کی پابندی کر رہی ہے۔ اب کوئی چیز مجھے دل شکستہ نہیں کر سکتی جس کا آج سے چند سال قبل میں شکار تھا۔
(عبدالرحمٰن میر، کشمیر)

۸۔ انجمن مظہر الحق کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے کشمیر کا سفر کیا۔ ۲۹ جون کو وہاں پہونچے اور ۳ر جولائی ۱۹۸۹ کو واپسی ہوئی۔ اس سلسلہ میں سرینگر اور بعض دوسرے مقامات پر خطاب کیا۔ ایک خطاب کا عنوان "اسلام اور خدمت خلق" تھا۔ دوسرے خطاب کا عنوان ـــــ اسلامی عبادت۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ آئندہ الرسالہ میں شائع کردی جائے گی۔

۹۔ الرسالہ کے ایک قاری لکھتے ہیں: ایک مقامی مسلمان لیڈر آپ کی بعض تنقیدوں سے برہم تھے۔ کیونکہ اس کی زد ان کے اوپر پڑتی تھی۔ انھوں نے کہا کہ میں الرسالہ کے "مولوی" کے خلاف لیگل کارروائی کروں گا۔ میں نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کے انتخابی حلقہ میں سب سے زیادہ الرسالہ پڑھا جارہا ہے۔ ایک ایک پرچہ کو بسا اوقات سو سو آدمی پڑھتے ہیں یا پڑھوا کر سنتے ہیں۔ اگر آپ نے الرسالہ کے خلاف کوئی کارروائی کی اور انھوں نے آپ کا قصہ الرسالہ میں چھاپ دیا تو آپ کے ووٹ یقیناً کٹ جائیں گے۔ اس پر وہ خاموش ہوگیے۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ الرسالہ کے اثرات کہاں تک پہونچ چکے ہیں۔

۱۰۔ عبدالرؤف خاں صاحب (عمر کھیڑ) نے ۱۶ جون ۱۹۸۹ کی ملاقات میں بتایا کہ عمر کھیڑ (مہاراشٹر) کے اسپتال کے سول سرجن ڈاکٹر اشوک امبھورے نے انگریزی الرسالہ کے بعض شمارے دیکھے۔ پھر کچھ لوگوں نے ان کو اردو الرسالہ کے بعض مضامین پڑھ کر سنائے۔ اب ان کی دل چسپی الرسالہ سے اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ اردو الرسالہ کو براہ راست پڑھنے کے لیے اردو زبان سیکھ رہے ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے ایک ٹیوٹر کی خدمات حاصل کی ہیں۔ اس طرح کی خبریں دوسرے مقامات سے بھی مل رہی ہیں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط وکتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

AL-RISALA

Annual Subscription Rates:

	One year	Two year
INLAND	Rs. 48	Rs. 90
ABROAD (By air mail)	US $ 25	US $ 50
(By surface mail)	US $ 10	US $ 20

SUBSCRIPTION FORM

Please send me AL-RISALA

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years

Name .....

Address .....

.....

GIFT SUBSCRIPTION

Please send AL-RISALA to my friend/relative to the following address:

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years I am enclosing cheque Postal Order/Bank Draft/M.O. Receipt No. .....

Name .....

Address .....

.....

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
AL-RISALA C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

Delhi Postal Regd. No D(SE) 243 ☐ RNI 22882/76 ☐ October 1989 No 155 ☐ Rs. 5

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدّین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	125/-
〃 〃 جلد دوم	125/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمتِ قرآن	25/-
دین کامل	40/-
الاسلام	30/-
ظہورِ اسلام	30/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	50/-
صراطِ مستقیم	30/-
خاتونِ اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	30/-
اسلام اور عصرِ حاضر	25/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	15/-
رشدیات	
تعمیر کی طرف	6/-

تبلیغی تحریک	15/-
میوات کا سفر	30/-
اقوالِ حکمت	15/-
تعبیر کی غلطی	40/-
دین کی سیاسی تعبیر	12/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	7/-
تجدیدِ دین	
اسلام دینِ فطرت	5/-
تعمیرِ ملّت	5/-
تاریخ کا سبق	5/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیاتِ اسلام	5/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	5/-
ایمانی طاقت	5/-
اتحادِ ملّت	5/-
سبق آموز واقعات	5/-

زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	5/-
اسلامی دعوت	5/-
خدا اور انسان	5/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	3/-
دینی تعلیم	5/-
حیاتِ طیّبہ	5/-
باغِ جنّت	5/-
نارِ جہنّم	5/-

God Arises	Rs. 55/-
Muhammad The Prophet of Revolution	60/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	8/-
The Good Life	7/-
The Garden of Paradise	7/-
One Fire of Hell	7/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	3/-
सच्चाई की तलाश	5/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳